ماہتاک کوئٹہ

سنگت

JULY 2024

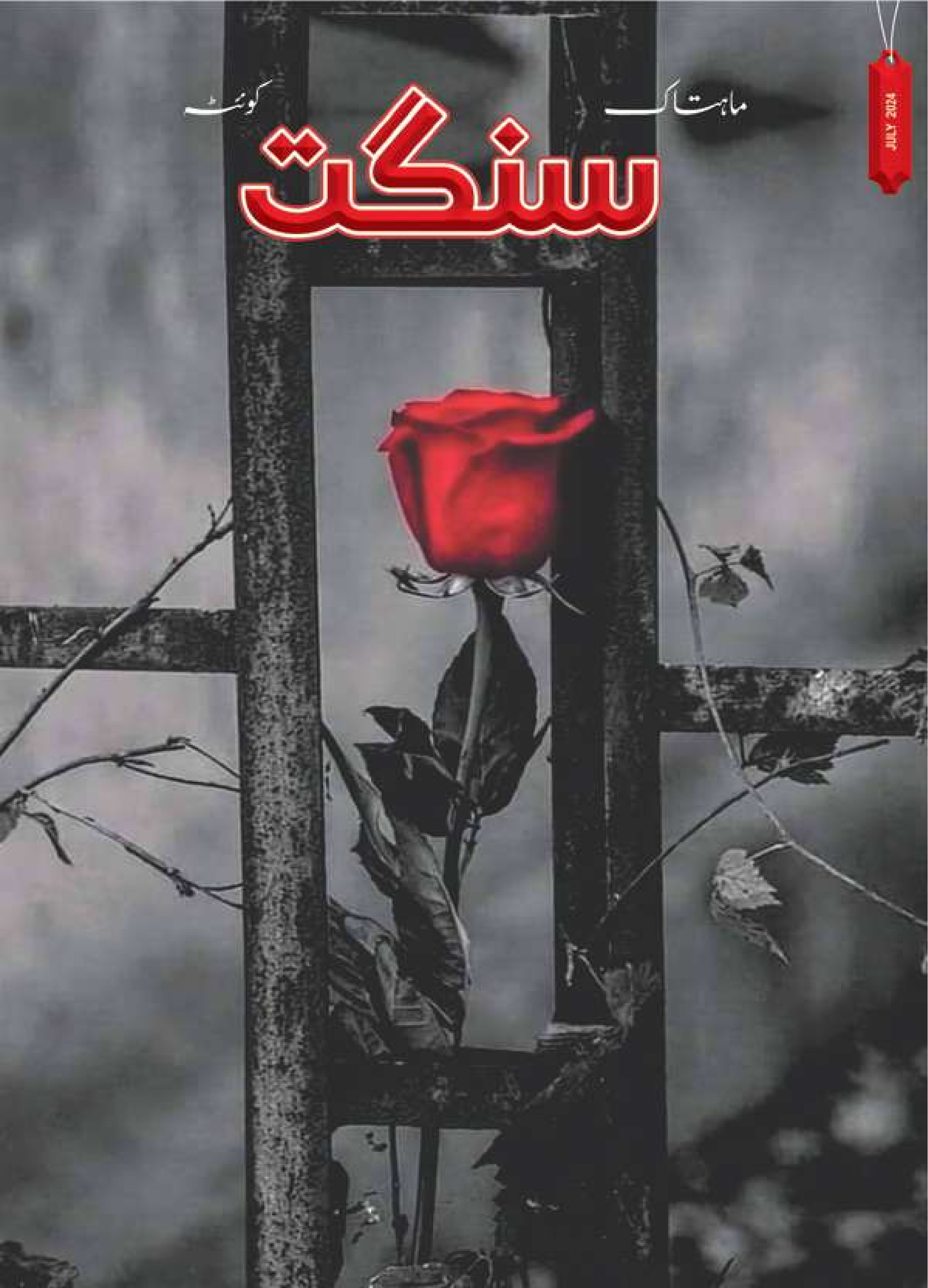

غیر معمولی شاندار عورت

مایا اینجلو / سلمیٰ جیلانی

حسین خواتین حیران ہیں میری خوب صورتی
کا راز کیا ہے
میں روایتی حسین ہوں نہ فیشن ماڈل کے سانچے
میں ڈھلی ہوں۔
لیکن جب میں انہیں بتانے لگتی ہوں،
وہ سمجھتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔
میں کہتی ہوں
یہ سب میری دسترس میں ہے،
میرے کولہوں کے بھنور ،
میری متوازن چال
میرے لبوں کے گھونگر
میں ایک عورت ہوں
غیر معمولی طور پر
شاندار
غیر معمولی عورت،
جو میں ہوں۔

میں ایک کمرے میں داخل ہوتی ہوں
اتنی پر سکون اور مطمئن جتنے کہ تم ہو
اور ایک آدمی
جس کے ساتھی اس کے آس پاس کھڑے ہوں
یا زانوں کے بل گر پڑے ہوں
پھر وہ میرے گرد دیوانہ وار گھوم رہے ہوں،
جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ۔
میں کہتی ہوں
میری آنکھوں میں شرارے ہیں
اور میرے دانتوں کی چمکتی کوند ،
میری کمر میں لچکتے ہوئے خم ،
اور میرے قدموں میں رقص کی سرخوشی۔
میں ایک عورت ہوں
غیر معمولی طور پر
شاندار

غیر معمولی عورت،
جو میں ہوں۔

مرد خود بھی حیران ہیں۔
آخر ایسا کیا وہ مجھ میں دیکھتے ہیں۔
وہ چاہتے ہوئے بھی
چھو نہیں پاتے
میرے اندر چھپے ہوئے اسرار
جب میں انہیں ظاہر کرنا چاہتی ہوں
تو بھی وہ نہیں دیکھ پاتے
اگرچہ وہ اس کشش کو محسوس کرتے ہیں۔
میں کہتی ہوں
یہ میری کمر کی لچکتی کمان میں پوشیدہ ہے،
میری مسکراہٹ کی تابناکی میں،
میرے سینے کے ابھار میں ،
میرے پر وقار انداز میں۔
میں ایک عورت ہوں
غیر معمولی طور پر۔
شاندار عورت،
جو میں ہوں۔

اب تم سمجھے
میرا سر کیوں خم نہیں ہوتا
نہ میں بلند آہنگ ہوں اور نہ قلانچیں بھرتی
ہوں۔
یا واقعی مجھے اونچی آواز میں بات کرنی ہوگی۔
جب تم مجھے قریب سے گزرتے دیکھو،
یہ سب خود پر فخر کرنے کے لئے کافی ہے
میں کہتی ہوں،
یہ میری ایڑیوں کی ٹک ٹکاہٹ میں ہے،
میرے بالوں کی لہریں
میری ہاتوں کی ہتھیلیاں
میری دیکھ بھال کی منتظر ہیں
، کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔
غیر معمولی طور پر۔
شاندار
غیر معمولی عورت،
جو میں ہوں۔

Reg No. DCS-6

مسلسل ماہانہ اشاعت کا 27 واں سال

ماہتاک

سنگت

کوئٹہ

Vol.27
JULY 2024
NO.08

ایڈیٹر

شاہ محمد مری

پرنٹر

صادق پرنٹنگ پریس کوئٹہ

ایڈیٹوریل بورڈ

جاوید اختر، جمیل بزدار، عابدہ رحمٰن، جہاں دوست، شاہ ملوک

قیمت	شش ماہی	سالانہ
200 روپے	1200 روپے	2400 روپے

ISSN-2520-4070

ملتان : رانا شہباز 03009632552 ، اورنواز پانڈا 03008634392

کراچی : عیسیٰ بلوچ 03222609415 ، اورشاہ زمان 03002103503

ساہیوال : زکریا خان 03006931011

0812827968 , 03003829300

editor@sangatacademy.net

MARRI LAB DR SHER MUHAMMAD ROAD QUETTA

www.sangatacademy.net

SHONGAAL

مانو کہ خود سے جھوٹ بولتے رہے ہو!	3

KISSA

البلّی	آغا گل	39
روشہ مزوری	عبدالعزیز بگٹی	43
مہمان	مہتاب جکھرانی	44
تعلق	از حنا خراسانی رضوی	45

POHOZAANT

اوئے میں نئیں او تیڈے جنگلے منّنے	فیاض باقر	5
مین سٹریم بنے رہنے کا نشہ	ایک اداریہ	6
جند وفقیر	رزاق شاہد	9
چیپاں مور	ماوث	11
شامِ غم بھی گزر جاتی ہے ایک دن!	راجہ نجیب اللہ خان ستی	13
کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر	عوامی جمہوریت۔۔	15
پولیٹیکل اکانومی (علم المعیشت)	سی، آر، اسلم	18
ریاست وانقلاب	لینن/بلوچی ترجمہ	21
فہمیدہ ریاض، ایک ناغمان دانشور	شاہ محمد مری	23
اوبیتانی بانک	شاہ محمد مری	25
سموکا حسن	--	29
امین کھوسہ کے نام یوسف مگسی کا خط	--	33

SHERAANI RALI

مایا اینجلو / سلمٰی جیلانی/نسیم سید	
لالہ رخ	8
کاوش عباسی، دانش داغ	10
احمد ندیم قاسمی	12
شہزاد	14
تنویر انجم	34
مایا کوفسکی	35
ابوامریز	36
گرک، آمنہ ابڑو	37
سندھو پیرزادہ	38
عاطف توقیر	48

KITAB PACHAAR

ایک معیاری کتاب	عبدالمطلب مینگل	38

مانو کہ خود سے جھوٹ بولتے رہے ہو!

ا

دماغوں میں کم غذا ڈالنے والے ہمارے حکمران دوسروں کے سامنے جھوٹ بولتے رہنے کے اتنے عادی بن چکے ہیں کہ اب وہ اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ انہیں اب احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ خود سے جھوٹ بول رہے ہیں۔

ہم 2024 کے بجٹ پر بات ہی نہیں کرتے کہ یہ جاگیرداروں، مولویوں، پیروں، میڈیا مالکان، فوج، بیوروکریسی، اور عدالت کا بجٹ ہے۔ ایسے لوگوں اور طبقوں کا بجٹ جو عوام کے مدمقابل کھڑے ہیں۔ اس لیے عوام کو ان سے بھلائی کی کوئی توقع، کوئی امید نہیں۔ عوام سولر کی بجلی استعمال کرنے پر مجبور ہیں، وہ پینے کے لیے پانی کا پرائیویٹ ٹینکر منگواتے ہیں، اس کے بچے گندے اور پست پرائیویٹ سکول میں پڑھتے ہیں، سرکاری سہولتیں نہیں ہیں لہٰذا لوگ پرائیویٹ ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں، میونسپل کارپوریشن گلی محلوں سے کچرا نہیں اٹھاتی۔ حتیٰ کہ جان و مال کی حفاظت بھی سرکار نہیں کرتی اس لیے گلی میں پرائیویٹ چوکیدار رکھنا پڑتا ہے۔

مہنگائی اور بے روزگاری دو نوکیلی سینگیں ہیں جو مزدوروں کسانوں، ماہی گیروں اور مڈل کلاسز کے سینوں میں پیوست ہیں۔ اس لیے بجٹ کی تیاری پہ جتنے گھنٹے لگے، ٹی وی پہ اس کے بارے میں گفتگو کے جتنے دن لگے سب کا مقصد انہی دو، نوکیلی سینگیں سہنے کے لیے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ ارب پتی حاکموں کو کسی غریب کی بیٹی کی شادی نہ ہو سکنے کے غم کا بھلا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کروڑوں کسانوں کی گندم نہ خرید کر کتنی بڑی تباہی مچا دی گئی مگر آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے ضحاکوں کو کیا پرواہ۔ یہ اتنے فضول لوگ ہیں کہ بجٹ کو بہتر تو بنا نہیں سکتے، بس اچانک ٹھک سے فیملی پلاننگ کو بطور حل پیش کرتے ہیں۔ سرکار، عوامی بہبود والے بجٹ کی اپنی دروغ گوئی میں واقعتاً سمجھتی ہے کہ اس نے اچھا بجٹ پیش کیا ہے۔

حکمران طبقات واقعی سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں بسنے والی قومیں بہت خوش ہیں۔ مسنگ پرسنز کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جگہ جگہ فوجی کارروائیاں لوگوں کو نظر نہیں آ رہیں۔ انہیں یقین ہے کہ بلوچ کو گوادر کے کھو جانے کا کوئی رنج نہیں، ریکوڈک اور سیندک معمولی سی باتیں ہیں۔ حکمرانوں کو واقعی یقین ہے کہ محکوم قومیں جدید نوآبادی نظام کو نہیں سمجھتیں۔

حکمران طبقات کا پکا خیال ہے کہ وہ بنیاد پرست نہیں ہیں۔ انہیں اپنے اس سب سے بڑے جھوٹ کے جھوٹ ہونے پر بھی یقین نہیں ہے کہ وہ ہی پین اسلام ازم کی سب سے منظّم "سیاسی" پارٹی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ مجمع کی طرف سے کافر قرار دے کر لوگوں کو ننگا کرنے، جلا ڈالنے اور لاش گھسیٹنے میں حکمرانوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو نصاب انہوں نے بنا رکھا ہے وہ بہت ہی رواداری سکھانے والا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ انہوں نے پچاس سال سے افغانستان میں جو شدادی کی وہ محض شغل تھا، اور اس کا کوئی ردعمل نہیں پکے گا۔ ان کا خیال ہے کہ ضیاء الحق سے لے کر پرویز مشرف تک ملک کے چپے چپے میں جو مدارس قائم کیے گئے اُن کا اثر بالکل نہیں نکلے گا اور مذہبی جنونیت نہیں پھیلے گی۔ حکمرانوں کا خیال ہے کہ اسلحہ وہی، فوج وہی، فوجی بھی وہی اور طالبان بھی وہی مگر اُسی آپریشن کا نام تبدیل کر دینے سے جنگ کا نقشہ بدل جائے گا۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ دہشت گردی صرف جنگ اور آپریشن کے ذریعے ختم نہیں ہوتی۔ کبھی اس نامعلوم مالک کا پراجیکٹ "آپریشن راہِ حق" کے نام سے جاری رکھا گیا پھر نام بدل کر "آپریشن راہِ راست"۔ بات نہ بنی تو "راہِ نجات"، "ضربِ عضب" اور "رد الفساد"۔۔۔ اور اب اس کا نام "عزمِ استحکام" رکھا گیا ہے۔ جھوٹ بول بول کر انہیں اندازہ ہی نہ رہا کہ لڑنے والے دونوں فریق بنیاد پرست ہیں، دونوں فریق اقلیتوں کو تباہ و برباد کرنا، یا اپنے مذہب اور اپنے فرقے میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں اطراف دنیا بھر میں یہودی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں

۔دونوں ہی مغرب کو کفر کا گڑھ سمجھ کر اسے نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں ۔حکمران اپنی پالیسی میں ذرا سی تبدیلی کیے بغیر سمجھتے ہیں کہ وہ مذہبی بنیاد پرستی کے خلاف جنگ جیتیں گے۔۔۔۔غضب یہ ہے کہ یہ سارے آپریشن بنیاد پرستی کے ہیڈ کواٹر صوبے میں نہیں ہو رہے بلکہ یہ بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں ہوتے رہے ہیں۔

انہیں واقعی یقین ہے کہ ساری معاشی ،سماجی اور کلچرل ناانصافیوں بے عدلیوں کے باوجود ملک کو کچھ نہ ہوگا۔ وہ نومئی دوبارہ نہ ہونے پہ بالکل واثق یقین رکھتے ہیں اوران کا یہ بھی یقین ہے کہ 9 مئی والوں کی سوچ میں اورخوداُن کی اپنی سوچ میں بہت فرق ہے۔

یہ اس قدر نابینا ہیں کہ انہیں مذہبی اقلیتوں پہ جاری غیر انسانی سلوک نظر ہی نہیں آتا۔انہیں اندازہ ہی نہیں کہ بے حقوق اقلیتی فرد جب مسکرانا بھی چاہے تو اُس سے رونا نکلتا ہے ۔انہیں واقعی اندازہ نہیں کہ عورتیں جانوروں کی زندگیاں جی رہی ہیں۔تعلیم وصحت سے محروم،مشقت وگھریلو تشدد سے لدی پھندی اور ہمہ وقت طلاق وسیاہ کاری کے بھیانک خوف میں جیتی ہیں۔

جھوٹ بول بول کر اب انہیں یہ بات جھوٹ لگتی ہی نہیں کہ الیکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ان کو پکا یقین ہے کہ پاکستان میں پارلیمنٹ سپریم ہے ،عدلیہ آزاد ہے ، پریس فری ہے ، ٹریڈ یونین ازم پہ کوئی پابندی نہیں ہے ۔سٹوڈنٹس پالٹکس پہ کوئی قدغن نہیں ہے ۔ وہ واقعی سمجھتے ہیں کہ عوام Soverign ہیں۔ وہ چاہیں اسے ففتھ جنریشن پروپیگنڈا کہیں یا سکستھ ۔۔۔۔لیکن انہیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ یہ داؤ پیچ کسی دشمن ملک پہ استعمال نہیں کررہے بلکہ اپنے ہی عوام پہ اس کا اطلاق کررہے ہیں۔اُن کو ابھی تک احساس نہیں ہے کہ انہوں نے سب سے بڑا دشمن پاکستان کے عوام کو سمجھ رکھا ہے۔

حکمران طبقات کو اندازہ ہی نہیں کہ سارے ادارے مفلوج کردیے گئے ہیں۔ایک بھی ادارہ سلامت نہیں۔ایک بھی سیاسی پارٹی سالم نہیں۔

فیوڈلوں اور سول وملٹری بیوروکریسی کا پیدا کردہ معاشرہ کپٹلسٹ نظام کی سیاسی معاشی سماجی کلچرل اور نظریاتی بحران کا مجسم نمونہ بن چکا ہے۔ حکومت پہ اعتماد اس کی تاریخ میں سب سے نچلی سطح پہ ہے۔ بڑھتے ہوئے عدم مساوات پہ عوام الناس کا غصہ اس کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہے۔ جامد اجرتیں ،بلند قیمتیں ،کلائمیٹ تبدیلیاں ۔۔۔۔یہ سب خوف کے بڑھتے ہوئے احساس ،عدم استحکام اور غیر یقینیت کو بڑھاتی ہیں۔ابلاغ عامہ ،علم کے مراکز اور سیاسی پارٹیوں سے بددلی اب بہت وسعت پا چکی ہے۔ یہ سب کچھ ،اعتبار اور شناخت کے جامع بحران کی غمازی کرتا ہے۔فاشزم اب متبادل کے بطور خوب پروان چڑھ رہا ہے۔

ستر برسوں سے جاری ایک مارشل لائی ، ون یونٹی اور ملّا ئیت والی حکمرانی نے سوائے بے کیفی اور کرپشن کے کچھ بھی پیدا نہ کیا۔عقل ودلیل اور مباحثے کی گنجائش کم سے کم ہوتی گئی۔سوچنے اور سوال کرنے کی عادت کی حوصلہ شکنی کرتے کرتے سارے معاشرے کو ’’بے شک ، بے شک‘‘ اور’’جی سر، جی سر‘‘ کرتے رہنے پر لگا دیا گیا۔نئے نئے آئیڈیاز کو نیست ونابود کرنے کے لیے بیلا رس نامی ٹریکٹروں جتنی ہیوی مشینری سے بند باندھے گئے ،انسان کے وقار کا وقار ختم ہوا۔سولائزیشن کی جگہ ڈنڈے ماری اور بربریت نے لے لی۔

حکمران گذشتہ پون صدی سے انسانیت پہ غیر انسانیت مسلط کرتے رہے ہیں،اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والی عوامی مزاحمت کو سختی سے کچلتے رہے ہیں۔ جب اکثریتی حصے میں انکار اور اختلاف نہ رہے تو انسان اور (چنانچہ پورا سماج) آہستہ آہستہ اپنی انسانیت کھوتا چلا گیا۔اور اب یہ ایک بانجھ خطہ رہ گیا۔اگر کہیں کچھ ہے بھی تو مشترکہ حقوق کی بات نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے فرعون لیڈروں کے لیے آپس میں دست وگریبانی ہے۔۔جاہل ترین معاشرہ۔خوف کے ہاتھوں دوچہروں والا معاشرہ۔اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولنے والا معاشرہ!

اِس جھوٹے ،الٹے سماج کو سیدھا کرنے کا عزم کرنا بھی ایک بڑی نیکی ہے۔ یہ ایک فرد سے نہیں ہوگا،ایک ماہ ایک سال میں نہ ہوگا۔ یہ تو ایک منظّم وباشعور اور مضبوط سیاسی انقلابی پارٹی کی قیادت میں عوام الناس کی وسیع شرکت سے ممکن ہوگا۔اُس جانب بڑھیے۔کسی مہا انقلابی کا انتظار نہ کیجئے۔ اپنے موقف کو لے کر اپنے اپنے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں منظّم ہونا شروع کیجئے۔

اوئے میں نئیں اوتیڈے جنگلے منّے

فیاض باقر

شمعون کے آنجہانی ہونے کی خبر ملی تو خیالات اور یادوں کا ایک انبوہ کثیر وارد ہو گیا۔ پشتو زبان کا ایک محاورہ ہے کہ درخت کی لمبائی اُس کے گرنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ شمعون نے بہت خوبصورتی سے بہت سی متضاد کیفیتوں کو اپنے جیون میں جمع کیا ہوا تھا۔ وہ کمیونسٹ بھی تھا، سانجھ خدائی میں یقین رکھتا تھا لیکن اُس نے اپنے گرد ایک انتہائی نا قابل تسخیر اور غیر اعلانیہ حصار قائم کر رکھا تھا جس میں ''بغیر اجازت اندر آنا منع تھا''۔ اُس کا پوری زندگی لگا تار اپنے آپ سے ایک شدید مکالمہ جاری رہا اور وہ اس قیمتی جذب و مستی کی کیفیت میں نا معقول مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کا ''غیر'' سے تعلق محبوبی کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ جو آداب عاشقی سے نا واقف تھے وہ اُس کے انتہائی نجی حصار میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

میری شمعون سے مُلاقات اپنے دوست نذیر چوہدری کے ذریعے مُلتان میں اُن دنوں میں ہوئی جب وہ نشتر میڈیکل کالج مُلتان میں ''ڈاکٹری'' کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اُسے طبیب، شفا دینے والے (healer) اور بیماری کی سماجی جہت سے لڑنے والوں کے درمیان فرق بخوبی معلوم تھا۔ علم اور مُنافقت کے درمیان فرق کو وہ آنکھوں سے اوجھل کرنے پر راضی نہیں تھا۔ اسی لئے جب شمعون کی یاد آئی تو مجھے نجم حُسین سید کی یہ لائن یاد آ گئی ''اوئے میں نہیوں تیڈے جنگلے منّے''۔ نشتر کالج کے دنوں میں ایک دن مجھے شمعون نے کہا کہ ہمارے غریب اور لاچار ٹی بی کے مریض جب ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتا ہے یہ دوائی ہے اور روزانہ سوا کلو قیمہ کھایا کرو۔ وہ قیمہ کھا سکتا تو اُسے ٹی بی کیوں ہوتا۔ بات تو ٹھیک تھی ہمارا نام نہاد ''سائنسی علم'' بھی لکھی پر مکھی مارنا سکھاتا ہے۔ جن لوگوں کی سوئی مذہب اور سائنس کے درمیان مُجادلے پر اٹکی ہوئی ہے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ علم کو معاشرت اور سماجی حقیقت سے الگ کر دیا جائے تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ متن سائنس کی کتاب سے لیا گیا ہے یا الہامی کتاب سے۔ جو علم زندگی سے باہمی تعلق قائم نہیں کرتا وہ صرف مجاوری، دکانداری اور چھینا جھپٹی کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ ایسا علم اگر دین کے نام پر سیاست کا حصہ بن بھی جائے تو چنگیزی کا آلہ کار رہی ہوتا ہے۔

علم کے نام پر جاری منافقت سے شمعون کی لڑائی اُس کی پوری زندگی پر حاوی رہی۔ اُس نے زندگی میں موجود منافقتوں سے بھی بھرپور لڑائی لڑی اور اُس کی بھاری قیمت ادا کی۔ میرے خیال میں یہ گھاٹے کا سودا نہیں:

یہ رُتبہ بُلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

میڈیکل کی تعلیم کے آخری سال میں شمعون کو اُن کے ایک اُستاد نے فزیالوجی کے امتحان میں فیل کر دیا۔ یہ سو نمبروں کا شاید انتہائی آسان پرچہ تھا- استاد محترم نے فزیالوجی کی بجائے بے باکی کے نمبر لگا کر شمعون کے لئے ڈگری لینا ناممکن بنا دیا۔ شمعون نے سر نہیں جھکایا ڈگری پر لعنت بھیجی اور کالج چھوڑ دیا۔

مُلتان میں شمعون طالب علم، مزدور اور کسان تمام محاذوں پر سرگرم تھا۔ اُس زمانے میں بہت سے خواب دیکھنے والے، مجنون اور دلبر لوگ شمعون کے ساتھیوں میں تھے۔ محبوب مہدی، مجاہد مرزا، برکت علی، ظفر زیدی، ناصر زیدی، عزیز نیازی، فواد علی شاہ، خان محمد نثار، ٹونی، شاہد مُبشر، تنویر اقبال اور بہت سے دوسرے۔

روزی کمانے کے لیے اس نے صحافت کا سہارا لیا۔ اُس کے دوستوں کے حلقے میں حسن نثار، فوزیہ رفیق اور دھنک کی ٹیم کے کُچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔ اس صحافتی کیریئر کے دوران اس نے لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔ اور انقلابی سیاست سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ جن دنوں شمعون نشتر میڈیکل کالج چھوڑ کر لاہور آیا تو میں بھی اپنے دماغی خلل کی وجہ سے گول یونیورسٹی میں نوکری چھوڑ کر لاہور میں مُقیم تھا۔ تعلیم چھوڑنے سے پہلے میں اور شمعون دونوں پروفیسر گروپ کے ساتھ کام کرتے تھے اور این ایس او کے ممبر تھے۔ بعد میں امتیاز عالم کے اصرار پر میں مزدور کسان پارٹی میں شامل ہو گیا۔ چند سال بعد ضیاالحق کے ابتدائی سالوں میں امتیاز نے مزدور کسان پارٹی سے علیحدگی اختیار کر کے لوک پارٹی بنالی۔ شمعون مُجھے لوک پارٹی میں شمولیت کی دعوت دینے کے لئے میرے گھر آیا۔ میں لوک پارٹی میں تو شامل نہیں ہوا لیکن ہم نے مل کر ضیاالحق کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کا خواب ضرور دیکھا اور نتیجتاً ''ہمیں اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔

میری شمعون سے آخری ملاقاتیں 2014-15 میں ایمسٹرڈیم میں ہوئیں۔ صباحت حمید کے ساتھ۔ اُن کی تشنگی ابھی تک برقرار ہے۔

رہ وے قاضی دل نہیوں راضی
گلاں ہوئیاں تاں ہوون والیاں وو

ایک اداریہ

مین سٹریم بنے رہنے کا نشہ

ہمارے وطن اوراس کے اردگرمہیب و گھمبیر درد موجود ہیں۔ پہاڑ جتنے ، بے انت، عمیق اور نا قابلِ بیاں طور پر دردناک درد۔ ایسے فکری وجسمانی زخموں کا درد جومندمل ہونے کا نام نہیں لیتے۔ لاشوں میتوں کا غم جنہیں گیدڑوں نے مارا اورلومڑیوں نے کاٹ کھایا، آنسوؤں کا درد جو دکھ کم نہیں کرسکتے، آہوں کا درد جو سات آسمان پہ جا کربھی بے جواب لوٹ آتی ہیں۔ روٹی' کا غم جومحنتِ شاقہ کے بعدبھی قریب نہیں آتی۔ احترام کا دکھ جوسماج سے روٹھ چکا ہے۔ تحفظ جوٗاب رہا ہی نہیں............اور آزادی کا دکھ جو نہ بولنے لکھنے میں موجود ہے اور نہ تنظیم کاری میں۔ فاشزم کا نافذ کردہ خوف جس نے انسانوں کو اصطبلوں کا بنا کر رکھا ہے ....قعرِ مذلت میں پڑے پورے سماج کی بیماری کا دکھ جسے کوئی حکیم اورفلاسفرٹھیک نہیں کر پا رہا ہے۔

ذمہ داریوں اور احساسِ ذمہ داری کے انبار موجود ہیں۔ سماج، اپنے ہرممبر سے اِس گھمبیر معاشی سیاسی سماجی بحران کے دلدل سے اُسے نکالنے کے تقاضے کررہا ہے۔

ہمارا بالائی معاشی وسیاسی طبقہ بالکل بے پرواہ ہے، اُسے اپنی املاک کے نقصان کا ذرا بھی شائبہ نہیں، اُسے کوئی خدشہ کوئی احتمال اورخطرہ نہیں ہے۔ وہ تو خود خوف پیدا کرنے' بحران کو جنم دینے' والا کارخانہ ہے۔

اسی طرح سماجی شعور سے مبرا اور تنظیم کاری سے عاری نچلا محنت کش طبقہ اپنے روزمرہ کے مسائل و مصائب میں غرق ہے۔ سرمایہ داروں نے اُس کے بہلانے (الجھانے) کو ہزار ترکیبیں کردی گئی ہیں۔ اُس طبقہ کو ایک ایسا مفلوج عضو بنا دیا گیا ہے جس سے بس، فارغ اوقات میں فرقہ واریت کے جلوس ہی نکلوائے جاسکتے ہیں۔ بورژوا اور رجعتی بورژوا پارٹیوں نے اپنے اپنے لیبر ونگ بنا کر مزدوروں کو انہی بورژوا لیڈروں کے سالگرہ کیک پر ٹوٹ پڑنے پر لگا رکھا ہے۔

رہ گیا ہمارا مڈل کلاس، تو یہ طبقہ خوف، حساسیت، عدم تحفظ اور غیر یقینی کے بحرالکاہل میں غرق رہتا ہے۔ خوفیں، جو بہت ہی پست معیار کی ہیں۔ اس طبقہ میں ٹی وی چینلوں کے موقع پرست، اور مالکان کے ترجمان اینکر شامل ہیں۔ اس طبقہ سے وابستہ بہت سارے جعلی اور نیم جعلی ڈگریوں کے سہارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی پکی نوکریوں اور کچھ نہ کرنے والے چوغہ بردار پروفیسروں کا ایک جمِ غفیر بھی شامل ہے، یہ طبقہ بدترین رجعت میں غرق وکیلوں ججوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور یہ طبقہ دادوتحسین کی بھوک میں پیدا شدہ بہت سارے شاعروں مصنفوں اورٹیکنو کریٹوں سے لے کر سیاست دانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سائنس دان، دکاندار، مولوی، شیخ، شاعر، ادیب اوردانشور مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مڈل کلاس لگتا ہے، بنا ہی خوف کے گارے پانی سے ہے۔ سٹیٹس کو سے اس طبقے کا مجرمانہ کمپرومائز اور دبک جانے سے ایسی خاموشی چھا گئی جس کے بوجھ سے شعور وعقل کے درو بام کی کمر دوہری ہوچکی ہے۔

غیر یقینی کی ابدی کیفیت میں غلطاں اِس بے چارے طبقے کے اندر جو سب سے خوفناک خوف موجود ہے، وہ ہے مارجنلائز ہونے کا خوف، اکیلے رہ جانے کا خوف، آئی سولیشن کا خوف۔ اُس کے لیے یہ خوف ملک الموت سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ اگر انقلابی ہے بھی تو ہمہ وقت سسٹم کے اندر رہ کر انقلاب کرنا چاہتا ہے۔ اور چونکہ اِس نے ہرصورت میں ''عوام کے ساتھ'' ہونا ہے اس لیے وہ جہالت کی ظاہری صورت اوڑھ لیتا ہے۔ وہ تو عوام کی ذہنی سطح کی باتیں ہی نہیں دھراتا بلکہ، کندھے پر ایک چادر اوڑھے چوبیس گھنٹے ایک لمبی تسبیح تھامے رہتا ہے جسے وہ پڑھتا نہیں۔

وہ نہ صرف رجعت پھیلاتا ہے بلکہ اُس کی مختلف صورتوں کے فرقے بنانے میں بھی خوب مدد دیتا ہے۔ پھر اُن فرقوں کے نعرے تراشتا ہے، منشوریں بناتا ہے۔ وہ نہ صرف بدمعاش کو ہیرو بناتا ہے اور قاتل کو نجات دہندہ قرار دیتا ہے بلکہ جہالت کی باتوں کوٗ بہت سارے واہموں کو کبھی بھی خارجی قرار نہیں دیتا۔ وہ انہیں اپناتا ہے۔ وہ دہشت اور دہشت گردوں کو glorify کرتا ہے۔ اُن پر فخر کرواتا ہے، دوسروں کو انہیں اپنانے کا موجب بنتا ہے۔

تنہا رہ جانے کے خوف سے بچاؤ کے لیے یہ بے چارہ طبقہ بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوڑ دوڑ کر اِس بہاؤ کے سب سے آسان اور مزیدار مظہر، این جی او میں پناہ لیتا ہے، وہاں وہ جمہوریت، انقلاب، سیکولرزم، لیفٹ ونگ، اور لبرل جیسے سرمایہ داری والے مجہول ومبہم وموہوم عنوانات پہ سیمینار یں کرتا کراتا ہے۔ وہ اپنے ریسرچ، قلم اور مہارت کے ضمیر وخمیر کی قربانی کی قیمت پہ اسی مین سٹریم سے چپکا رہتا ہے۔ یہ بے پیندا طبقہ ہرطرح کی جدوجہد اور تنظیم سے کنی کترا کترا کر خود کو سول سوسائٹی کہلواتا ہے، اور اُس کے مقرر کردہ سامراجی ٹائم ٹیبل پہ چلتے ہوئے کارپوریٹ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ کبھی ایک جھاڑی کے تھپیڑے کھاتا ہے کبھی کسی ہوا کے رحم وکرم

پہ ہوتا ہے۔ چونکہ اس طبقے نے عوام الناس کی اخلاقی اور سیاسی پوزیشنوں کو ترک کیا ہوتا ہے اِس لیے سماج کا عمومی روشن فکر میدان اچھے خاصے کٹاؤ کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

ہمارے خطے کے مڈل کلاس کو بے وزن و بے مقصد انگریزی الفاظ و ٹرمنالوجی کے بے جا استعمال نے بربادی کے کھڈے میں ڈال رکھا ہے۔ اصطلاحات، جو کارپوریٹ دنیا کے پروپیگنڈہ ڈیپارٹمنٹ سے نئے نئے ماڈل کی طرح تسلسل اور جدت کے ساتھ برستی رہتی ہیں۔ جونہی چٹخاروں میں لپٹی کوئی مردم دشمن اصطلاح مارکیٹ میں در آئی ہمارا عادی نشئی مڈل کلاس جوتے چپلی بھول کر اُس کی جانب لپک پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ طبقہ پی پی پی، اے این پی اور ایم کیو ایم جیسی دائیں بازو کی پارٹیوں کو بھی بائیں بازو میں بھرتی کر جاتا ہے (بایاں بازو خود بھی تو دایاں بازو ہوتا ہے، سرمایہ داری نظام میں بایاں بازو)۔

یہ ''مین سٹریمی'' مڈل کلاسیے جب کبھی کوئی کتاب چھپوائیں گے تو انتساب کے لیے ڈھونڈ کر کسی شہرت طلب سڑی ہوئی بااثر منافع بخش شخصیت کا نام لگا دیں گے۔ وہ اپنی کتاب خفیہ سودا بازی میں پلّے سے پیسے دے کر سب سے مرغن پبلشر سے ملائی جیسے کاغذ پہ شائع کروائیں گے۔ کتاب کی رونمائی کے بغیر تو سمجھو اُن کا حلالہ ہی نہیں ہوتا۔ اور یوں وہ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں اُس کی رونمائی کروائیں گے۔ چیف منسٹر مہمانِ خصوصی نہ ہو تو مین سٹریم کی گویا سند یافتگی ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا انا، خودی، اور عزتِ نفس گروی ڈال کر دھاندلی سے بیٹھے وزیراعلیٰ کے سورکنی بدرقہ وسٹاف کی آمد یقینی بنادی جاتی ہے۔

ایک طبقاتی معاشرے میں مین سٹریم انسان کون ہوتا ہے؟۔ ایک پالتو ترین جانور جس کے اندر خواہ کوئی بھی اشرف انسانی جذبہ انڈیل دیں، مگر اُس کے منہ میں لگام ہمیشہ فائیو سٹار ہوٹل اور سہ لفافائی دعوتی کارڈ کی پڑی رہتی ہے۔ ایک طرف سسکتی انسانیت کے لرزہ خیز مسائل ہیں اور دوسری طرف یہ نام نہاد حساس مگر اصل میں جامد و ساکت پتھر روحیں ہیں۔ اتنے اداکار کہ جب چاہیں انقلابی بن جاتے ہیں اور جب چاہیں رو دیتے ہیں۔ مشاعرہ، سیمینار، ویزا، سفارت خانہ، ٹکٹ، جہاز اور شیڈول جیسی منحوسات ہمارے مین سٹریمی مڈل کلاسیے کی زندگی کا مکروہ لباس بن جاتی ہیں۔ وہ اُن کی مزاحمت کر ہی نہیں سکتا۔ ایسے الفاظ سن کر ہی اُس کے ضمیر کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔.......... ٹیلیفون اور ای میل پہ اُس کی آمد، ایئر لائن کا نام، ریسونگ اور سی آف کی تفصیلات طے ہوتی ہیں.......... اور پھر کہیں آخر میں اتمامِ حجت کے بطور ''موضوعِ گفتگو'' کی بات ''بھی'' ہوگی۔ اور موضوع بھی کیا ہوگا؟: موجود سے بے تعلق، عوامی ضرورت وخواہش سے ماورا، مہمل ومبہم کا مجموعہ موضوع۔ اور موضوع خواہ جو بھی ہو اِس مین سٹریم زدہ دانشور وادیب نے دادا آدم کے زمانے سے لکھے ہوئے کمپوٹر میں محفوظ واحد مضمون کے پیراگراف ہی الٹ پلٹ کروانے ہوتے ہیں۔ صرف اوپر نیا موضوع پیسٹ کروانا ہے.......... اللہ اللہ خیر صلا۔ ویسے بھی ''سٹیٹس کو'' کی برقراری کے لیے متعین ملازموں کو انسانی موضوع اور مغز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس لگڑ بھگڑوں کا جاری وساری ایک ''گیٹ ٹو گیدر کلب'' ہے جو کبھی اِس شہر میں منعقد ہوتا ہے کبھی اُس دارالخلافہ میں۔

ہاں، بس جس شہر میں کارپوریٹ دنیا اپنے خرچ پہ یہ ''مین سٹریمی'' منعقد کروا رہی ہوتی ہے، اُس شہر میں موجود شناساؤں کو ایک آدھ فون اور ایس ایم ایس سے مطلع کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ تاکہ شاپنگ سنٹرز میں شاپنگ اشنان، تفریحی جگہوں کا مٹر گشت اور مروت سے خالی ثروت والوں کا طواف یقینی ہو سکے۔ پھر وہاں روانگی کے وقت، بڑے بڑے ناموں والے بے علموں سے لکھوائے گئے فلیپوں والی اپنی واحد لاشریک کتاب کی نیم درجن کاپیاں اٹھانا، وزٹنگ کارڈ کا پورا ڈبہ سامان میں رکھنا اور پھر ....سوٹ کیسوں پر سے پچھلے جہازی سفر کے ٹیگ اتار کر نیا ٹیگ لگا کر چل پڑنا ''مین سٹریم'' کی طرف 'جہاں کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے باڈی سپرے سے اٹے ہوئے جسموں، صدر نشینی کے امیدوار بدروحوں، لغو ومہمل باتوں کے سالار علاموں، ٹھگی اور شعبدہ بازی کے مجسم لفاظوں، خودنمائی کی جیتی جاگتی زنبیلوں، ابن الوقتی کے چالو کھلونوں، قیمتی کریم سے مرغن پلاسٹکی چہروں اور فروخت شدہ روحوں سے سجی'' مین سٹریمی دائمی مسکراہٹوں'' کی منحوس ایسڈ، رین کی برسات ہے۔ ایک آدھ سیشن میں تشریف فرما ہوئے، باقی میں سے سلپ ہو کر سکپ ہو گئے اور دیگر ''مین سٹریمی'' کاموں کو نکل پڑے۔ جن میں سیر سپاٹا، یہاں موجود فیصلہ سازوں میں تحفے بانٹنا، اور واپسی میں پیچھے موجود بااثر افراد کے لیے تحفے تحائف خریدنا لازمی ہیں تاکہ نئے سفر کے لیے سدا بہار راہیں ہموار رہیں..........

''واپسی پر ایک سفرنامہ، یا ایک کالم، یا شاعری کا ایک ٹکڑا 'ہو' جاتا ہے۔ اور سی وی موٹا کرنے کے لیے اگلی کتاب میں ''کہاں کہاں کا سفر کیا؟'' کے خانے میں ایک ملک کا اضافہ کرنے کی بے ضمیر بڑھک کا سامان ہو جاتا ہے۔

سرمایہ داری کے اندر مین سٹریم میں درست راستہ ہوتا ہی کہاں ہے؟۔ کچھ بھی کرو، بدبخت مارجنلائزیشن کا خوف دور ہی نہیں ہوتا۔ ہر شہر میں ایسے فنکشنوں کے سدا بہار انتظام کار موجود ہوتے ہیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار شدہ 'شہرت طلب اور پالتو بنائے ہوئے صوبائی سیکرٹریوں، ڈی سی اوز کو ہانک کر ہال کی اگلی نشستوں میں دھنسا دیتا ہے اور یوں وہاں ٹائٹانک جہازوں کو ہڑپ کر جانے والے، اور، سوٹوں، ٹائیوں اور کافوروں میں مدفون

زندہ مُردوں کا اضافہ کرتا ہے۔ہاں ہندوستان سے کسی سامراج دشمن عوامی لیڈر کا پوتا بھانجا ''مین سٹریم ''مہمان کا آنا لازمی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اِس'' نمائندہ'' اجتماع میں ملک کے اندر سے تلاش کر کر کے نام و مقام کے متلاشی ''سیکولر'' یا'' روشن فکر'' بھٹکے ہوئے دانشمندوں کا کوٹہ بھی پورا کیا جاتا ہے جنہیں بھی پنج ستارہ ہوٹل کی چکا چوندگی کی لت ڈال دی جا چکی ہوتی ہے۔

اس سارے یاترا بازیوں کے لیے کس قدر کف گیری ، چاپلوسی، چرب زبانی، رشوت و تحفہ گیری اور بہت کچھ پیش کرنے کی ضرورت پڑتی ہوگی؟۔اُس ''سب کچھ'' کو وہ لوگ ''پی آر'' کہتے ہیں۔

مین سٹریم شدہ یہ نیم انسانی بے خیر و بے مراد مخلوق کو ایک بات کا پتہ چل گیا ہے۔وہ اب عوام کے ہیروؤں کو بے ضرر بنا کر پیش کر سکتی ہے۔چنانچہ حسنِ آفاق سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے محروم، اپنے من میں موجود منوں گندگی کی موجودگی کا اندازہ لگانے تک کی بصیرت سے عاری یہ مجمع دو تین دن تک ہمارے ہیروؤں میں سے کسی ایک کی فکری میت کو اپنے غلیظ و غیر مہذب کرگسی چونچوں پنجوں سے خوب ادھیڑتا رہتا ہے۔اور پھر اگلی میت پہ اِنہی اُجلے کفنوں میں ملبوس مُردار خور لوگوں کے جلد باہم ملنے کے قول و قرار اور تاکید و التماس پہ یہ سیمینار بکھر جاتا ہے..........

اور اگلی میت کسی یوسف عزیز مگسی، بزنجو، کا کا صنوبر حسین، گل خان نصیر، فیض، جالب، فراز اور کسی شیخ ایاز کی ہی ہوگی۔ایسے معصوم لوگوں کی میت جو زندگی بھر'' مین سٹریم تھیوری'' پہ تھوکتے رہے..........

باوقار درد سے ناآشنا یہ مین سٹریم ادیب و دانشور!!

غزل

لالہ رخ لالہ

اک کشاکش میں گویا ہے فکر جہاں
جدلیاتی ہے پیکار برپا یہاں

ہر قدم آگہی ، کارواں ہے سفر
ہر گھڑی کھوج میں اک نیا کارواں

تم نظر سے بھلے دور ہوتے گئے
ہونہ پائے کبھی دل سے ہم بدگماں

شیخ جی آپ تو غور کرتے نہیں
چھو رہا ہے بشر گوشہ آسماں

ہم ہنسی میں اڑاتے رہے رنج و غم
سوز الفت سے جلتا تھا درد نہاں

کوکتی کوک کوئل ، سنی ہے ابھی
لو اٹھا حسرتوں کا وہ پھر سے دھواں

علم کی جستجو ہی میں فردا ترا
پاؤ گے اپنے قدموں تلے کہکشاں

فرصتیں ، قربتیں ڈھونڈتی تھیں مگر
شوق ہائے تمنا ، بجھے سے نشاں

سوچنے ، بولنے پر ہے قدغن کڑی
بھول جاتی ہوں منہ میں کبھی تھی زباں

رت بدلنے لگی ، گل کترنے لگی
پھر ہوئے سوچ کے بحر و بر بیکراں

دل نشیں ،مہ جبیں ،عقل کے ہمنشیں
کھو گئے ہیں کہاں ہم نفس پرفشاں

ناتوانی میں کچھ یاد باقی نہیں
تھے ہمارے کبھی بال و پر بھی جواں

نارسائی کے پیکان چبھتے رہے
وقت مرہم نہ ہو صبر آئے کہاں

وقت کے دوش پر پھر اڑے پل سبھی
اک فنا زد میں سارا زمان و مکان

سوچتے تھے جہاں میں کوئی دکھ نہیں
تیری فرقت میں جانے لگی اپنی جاں

گفتگو کا قرینہ عجب لالہ رخ
بات کرتے ہیں جیسے کڑی ہو کماں

جندو فقیر

رزاق شاہد

دادا!

آج دربار_ فرید کی زیارت کے لئے چلتے ہیں. مدت ہوئی آپ گاؤں سے باہر نہیں گئے.

ہاں بیٹا جوانی میں تو کبھی کبھی پیدل بھی چلے جاتے تھے.

اب پکے راستوں نے دل بھی پتھر کے کردئے ہیں.

روانہ ہوئے

دادا جان ایک شان بے نیازی سے عمارتوں اور سڑکوں کو دیکھ رہے تھے. باتوں اور یادوں کے دوران سفر جاری رہا.

دادا!

یہ کوٹ بہادر شوگر مل ہے. یہاں چینی بنتی ہے. یہ مل اپنی بجلی خود بناتی ہے بلکہ بیچتی بھی ہے.

یہ کوٹ، بہادر کب بنا؟

ویسے بیٹا بہادر کوٹوں میں تو نہیں رہتے.

پارک سے مشرقی سڑک پہ مڑنے لگے

تو کہا یہ تونگ کی سڑک ہے.

شہر میں زیادہ رش ہوتا ہے بائی پاس سے چلتے ہیں

رکنا ذرا، یہاں ایک سکول ہوتا تھا.

یہ سکول ہی تو ہے.

دکانوں کے پیچھے، سڑک پر دکانیں جو کھل گئی ہیں.

ورکشاپوں کے پیچھے،

کھاد کی دکانوں کی اوٹ میں، زہر کے سٹالوں میں

گھرا

سکول.

. اگر یہ سب نہ ہوتے تو ہنستے، کھیلتے بچے پھلواریوں کے بیچ دوڑتے، طالب کتنا اچھا لگتے اب تو سکول سے گزرتے زہر کی بو آتی ہوگی؟ ویسے سکول اب دکانیں ہی تو بن گئے ہیں اس لئے تیرا بھائی کہہ رہا تھا کہ میری بنک کی تنخواہ سے گزارا نہیں ہوتا گاؤں میں سکول کھولتے ہیں.

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا آگے بڑھے

مزار کے گنبد پر نظریں جمائے دادا اپنی دنیا میں کھو گئے.

سایہء □ دربار میں موٹر روکی اترے تو ایک خاک نشیں نابینا فقیر نے صدا لگائی.

دادا چونکے، قریب ہوئے، غور سے دیکھا

میں جلدی سے آگے بڑھا کہیں بے خودی میں گر نہ جائیں

تُو جندو فقیر ہے ناں؟

دادا اس کے قریب بیٹھ گئے. جندو پہلے تو تیرے رشتے روٹھے اب لگتا ہے آنکھوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے.

تو بشکو خان ہے؟

ہاں ہاں

کافی مدت بعد آئے ہو.

یہ نیا نڑیں کون ہے؟

یہ پوتری ہے میری.

یہ کہتے ہوئے جندو رو پڑا

بے دید آنکھوں کے آنسو خدا کسی کے نہ دکھائے.

دادا تڑپ اٹھے اپنے کرتے کی اندرونی جیب کی ساری رقم جندو کے ہاتھوں میں دی اور خامشی سے اٹھے..

مجھے کہا

گھر چلو

میں نے کہا

دادا! وہ زیارت، دربار...

خاموش رہے، دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گئے.

دور... سامنے دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگے یہ اینٹ گارے کے مدفن تو روزی دے رہے ہیں محلات والے چھین رہے ہیں

کافی دیر چپ رہے پھر کہا پیاس لگی ہے میں نے بوتل آگے بڑھائی کہنے لگا بہتا پانی زندگی دیتا ہے پیاس بجھاتا ہے بوتل واپس رکھ دی.

سڑک کنارے ٹیوب ویل چل رہا تھا رکنے کا اشارہ کیا

نیچے اتر کر بہتے پانیوں سے ہاتھ منہ دھویا، پیا

اسی دوران ایک جوان آیا سلام کیا اس سے پوچھا

یہاں قائم خان کی ہٹی ہوتی تھی؟

بزرگو! مدت ہوئی قائم خان فوت ہو گیا دکان بھی بند ہوئی.

دادا ہم دونوں سے مخاطب ہوئے اسی کچی سڑک پر قائم خان دکان سجائے مسافروں کی راہ تکتا، آنے والوں کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دیتا چونکہ دکان سے گھر ذرا دور تھا تو قائم خان نے ایک نقارہ رکھا ہوا تھا جتنے مسافر آتے اتنی مرتبہ نقارے پہ چوٹ مارتا اور گھر میں کھانا پکنا شروع ہو جاتا کھانا کھلا کر دعاؤں سے رخصت کرتا.

جوان کہنے لگا

اب کھانے کے ساتھ ساتھ انسان بھی بک رہا ہے اب کون کسے مفت کھلاتا ہے...

واپس گاڑی میں بیٹھے.

اب دادا کی طبیعت کچھ بہتر لگ رہی تھی.

میں نے پوچھا

آپ فقیر کو دیکھ کر اداس ہو گئے اور زیارت کئے بغیر واپس چلے آئے؟

تھوڑی دیر خاموش رہے

پھر بولے جندو کا والد بھی اسی دربار میں

بھیک مانگتا تھا تو راستے میں ملیں، فیکٹریاں دکانیں سڑکیں دکھا رہا تھا اور ترقی کی داستانیں سنا رہا تھا لیکن جندو تو تین نسلوں سے بھیک مانگ رہا ہے اس کی زندگی میں تو بدلاؤ نہیں آیا گارے سیمنٹ میں بدلے، لکڑی لوہے میں تبدیل ہوئی لیکن انسان تو ابھی تک بھکاری ہے. آپ نے جناح کو مار دکھایا پھر بھی جندو کی حالت نہ بدلی. میں اس جلسے میں موجود تھا جس میں لیاقت کو گولی لگی لیکن تب بھی جندو کی بیوی منگتی تھی.

ایوب نے دریا بیچ کے دیکھے جندو کا گھرانہ پھر بھی فقیر رہا.

جناح کی بہن کو رسوا کر کے دیکھ لیا،

" بھوکے " بنگالیوں کو جدا کر کے دیکھ لیا

جندو پھر بھی بھکاری رہا جب بنگالیوں کے برتنوں کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹیاں آپ کے بازاروں میں بک رہی تھیں اسی سال جندو کا باپ مرا. فقیری کی گدی جندو نے سنبھالی،

پھر بھٹو آیا وہ روٹی تقسیم کرتے کرتے کفر بانٹنے لگا جندو کی حالت پھر بھی نہ بدلی۔ پھر ملاں نے کہا بھٹو کو لٹکاؤ جندو سُکھی ہو جائے گا ایک کافر نے اسے کالی ٹوپی پہنائی لیکن اسی دن جندو کی بیٹی اغوا ہوئی اور بیوی نے زہر پھانک لیا پھر جس دن جلاد سے آموں کی پیٹیوں نے بدلا لیا اسی روز جندو کا بیٹا ہیروئین پیتے مر گیا.

ہم نے گوروں کے آگے سجدے کئے،

عرب پیسے سے اللہ کے گھر بنائے لیکن جندو فقیر کے گھر کی بھوک نہ مٹ سکی.

تجھے کربلا کا واقعہ یاد ہے؟ یزید کے دربار کا حال بھی پڑھا ہوگا. قتل حسین کے بعد جب علی کی بیٹی یزید کے دربار میں لائی گئی تو حسنین کی بہن نے دربار یزید کے پرخچے اڑا دیئے. یزید جیسا مردود اٹھا، معافی مانگی، چادر اوڑھائی اور عزت سے گھر روانہ کیا بیٹیوں کو تو یزید بھی نہیں مارتے لیکن تم نے بھٹو کی بیٹی کو بھی مار دیا...... جندو پھر بھی فقیر رہا......

اپنے شہر کے ٹول پلازے پہ گاڑی آہستہ ہوئی.

پونے بارہ بج رہے تھے ریڈیو چلایا تو خبر آئی وزیراعظم پاکستان نااہل قرار دے دیئے گئے ہیں.

دادا نے رکنے کا اشارہ کیا اور پوری خبر سنی.

انتہائی غصے میں کہا واپس چلو جلدی چلو...

میں حیران ہوا...... پچاس منٹ بعد دربار_ فرید پہنچے گاڑی سے اترے جندو کی صدا آئی اللہ کے نام پر

میری طرف دیکھا

بادشاہ تو ہٹا دیا گیا ہے پھر جندو ابھی تک بھیک کیوں مانگ رہا ہے؟

برِّصغیری اکثریت سے

کاوش عباسی

زور آور ہوئے ہو آج ایسے
اے زیادہ کہ کچھ چھپا ہی نہیں
کل تھے مفتوح و کم تر و کم زور
سچ یہ تم سے سہا گیا ہی نہیں
ڈرتے تھے تیغ اور گھوڑے سے
تم نے تسلیم یہ کیا ہی نہیں
ایک فطرت کا بھی سبق سن لو
کبھی اس سے کوئی بچا ہی نہیں
وہ سبق ہے کہ جیسے بھی تاریخ
گزری، اُس کو اگر کوئی ویسے
نہیں مانا ، کی اُس میں تبدیلی
اپنی مَن چاہی ، اپنے مطلب کی
تو ہے فطرت کا فیصلہ، وہ شخص
(شخص ہو قوم ہو، نہیں ہے فرق)
اُس کا ہر ایک آنے والا کل
برتر ، اونچا، کبھی ہوا ہی نہیں
نیچ پَن سے کبھی اٹھا ہی نہیں

نظم

دانش داغ

داستان باقی ہے

شام کے دھندلکوں میں
عکس تو مزیّن ہے
درد بھی نمایاں ہے
ہائے اُن نگاہوں میں
دید و بصارت کی
روشنی کہاں باقی!
چار دن کی چاہت کا
قصّہ مختصر لیکن
ہجرتوں کی موسم کا
درد و فغاں باقی
دوریوں کی دیوی نے
فرقتوں کی وادی میں
خواب کر دیئے صیقل
سب طلب جلائے پَر
درد کے نکھرنے کو
اور امتحان باقی
یاد کے دریچے سب
بند کر لیے کب کے
نیم وا نگاہیں کیوں
اب تلک کھٹکتی ہیں۔۔؟
اُن حسین آنکھوں کی
کیوں رہے نشاں باقی۔۔؟
شے مرید ہارا دل
جیت تو گیا چاکر
عشق کب مکمل ہے
اب بھی داستاں باقی

چیپاں مور

ماوث

پروفیسر ایڈورڈ سید بھی عدل وانصاف کی دُہائیاں لکھتے لکھتے فوت ہوگیا۔ فلسطینی جدوجہد کی آواز تھا وہ، دنیا بھر کے سیاسی سماجی معاشی طور پر نہتا کردہ لوگوں کا ساتھی تھا۔ وہ اس عہد کا نامور ترقی پسند دانشور تھا۔ ایڈورڈ، ابراہیم ابولغد اور ہمارے محبوب دانشور ڈاکٹر اقبال احمد خان مرحوم کا ساتھی تھا۔ ایک عظیم سکالر ،شاندار دماغ کا مالک تخلیقی فنکار، آزادی کا نغمہ گو، انصاف کا وکیل اور انسانی وقار کا ایک اور طرفدار اب دنیا میں نہ رہا۔ فلسطین کی شناخت، پروفیسر ایڈورڈ سید فوت ہوگیا۔

تاریخ کا ٹیڑھا پن دیکھیے کہ اس کی لاابالیوں کے باعث پوری انسانی تاریخ خون میں لت پت رہی ہے۔ فسلطین کا قصور کیا ہے جسے تاریخ سو سال سے اذیتیں دے رہی ہے۔ ہم اسے زیادہ سے زیادہ ''بے بختی'' کہہ سکتے ہیں۔ مگر بدقسمتی بھی ایک دن ایک ماہ ایک سال، ایک دھائی کی ہوتی ہے۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ یروشلم پر سویرہوتی ہی نہیں؟ ظلم ہی ظلم جو دلیل استدلال ،منطق سے مادرا مظہر ہے۔ صیہونیت پہ نہ فیور باخ وہیگل فٹ آتے ہیں نہ عینیت پسندی اس پہ صادق آتی ہے۔ صیہونیت بہت حقیر موت ہے، بہت خفیہ، بہت خفتہ---تاریک راہوں کی موت جو فلسطین کی گلیوں محلوں ، چار دیواریں ،شاہراہوں پر منڈلاتی رہتی ہے۔ سارے ٹی وی تھک گئے دکھاتے دکھاتے ،سارے فیضؔ معدوم ہو گئے لکھتے لکھتے ، سارے سوویت تحلیل ہوگئے بچاتے بچاتے، ہر اکیل بلڈوز کر دی گئیں یک جہتی کرتے کرتے-- مگر فلسطین کا رستا خون اب بھی جاری ہے۔ اور اس کا ریکارڈ رکھنے والا ایک اور مجاہد ایڈورڈ سید بھی نہ رہا۔

امریک عراق پر حملہ کرتا ہے، ڈبلیوٹی او کی میٹنگیں کرواتا ہے، پاکستان کرزی کو مضبوط کرتا ہے، سوئی میں ڈاکٹر حئی کو قوت دکھا کر روایتی قوتیں ایک بار پھر گوادر میں دس سال کی زندگی پاتے ہیں---- ساری توجہ ثانوی معاملات کی طرف ہے، اصل مسائل پسِ پشت۔ روٹی روزگار گوادر کے معجون بھرے نعرے کے پیچھے دفن۔ اور ایسا کرنے کے لیے دنیا کے ہر ملک کی بورژوازی کے پاس دانشوروں کا ایک غول موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسطین، پھر اوجھل۔ بے وارث فلسطینی بچہ بے نوٹس مر جاتا ہے۔ غلیل اٹھاتا ہے تو ٹینک سے کچلا جاتا ہے، بندوق اٹھالے تو بی بی سی اسے دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ کس قدر بدقسمت قوم ہے یہ، کہ سے یاسر عرفات گینگ کے مراعات یافتہ بورژوا بیوروکریٹک اشرافیہ اور اسرائیل کے پولیس مین بننے والے لیڈر ملے، غدار کرپٹ اور رجعتی بادشاہوں جیسے پڑوسی ملے۔ اس کے سارے اوسلو، سارے کیمپ ڈیوڈ ، سارے روڈ میپ تاریخ نے اپنی نشست گاہ کے نیچے داب رکھے ہیں۔ کوئی تعویز، کوئی حکمت اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی---- آپ لڑیں تو حماس بن جائیں، نہ لڑیں تو بلڈوز ہو جائیں، جمہوری بنیں تو امریکہ بات چیت سے انکار کرے---- آسمان ، تیرے ترس کی کھڑکی کب کھلے گی فلسطین پہ۔

فلسطین ہاٹ وار لڑا، کولڈ وار بھگتا، انطفادہ نمبر ایک جھیل گیا، انطفادہ نمبر دو پاٹ گیا۔ اس نے اوسلو میں شرمناک معاہدہ بھی سہا، اپنے خطے کا 78 فیصد حصہ تک اسرائیل کو دے دیا۔ آدھی سے زیادہ آبادی مہاجر بناڈالی ۔ اس نے اپنے عوام کی بے عزتی اور توہین دیکھی ، اپنے بچوں کی فصلیں تباہ ہوتے دیکھیں۔ بے روزگاری، کم خوراکی اور غربت چکھی، اپنی آبادی کو بے بسی سے قید بند میں، کرفیو میں، نسلی امتیاز میں مبتلا دیکھا ، ٹارگٹ کلنگ جھیلا، غیر قانونی اسرائیلی بستیوں کی تعمیر سہی-- مگر پھر بھی رحمت کی راحت کی ہوا کا ایک جھونکا تک اس بدنصیب سرزمین پہ نہیں آتا۔ آخر اس بد بخت آزادی کی قیمت کچھ تو ہوگی! دس عرب ڈالر، دس ہزار لاشیں، دس اذیت بھرے برس؟ فلسطین نے کیا کچھ نہ تجا اس لیلیٰ کے لیے! مگر اس کا دل ذرا نہ پسیجے، اس کا من ذرا نہ رام ہو، اس کا ترس ذرا نہ جاگے۔ اے آزادی کے رب ! ۔ اب تکلیف انسانی وسعت کی برداشت سے بڑھ چکی ہے۔

بزدل ترین شخص ہوتا ہے'' آقا''۔ غلام ترین مظہر ہوتا ہے سامراج۔ فاشسٹ ہے اسرائیلی حکومت۔ آقا، سامراج اور فاشسٹ کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تسکین کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ یہ چھ ماہ کے بچوں کو بلڈوزوروں ، ٹینکوں کے نیچے کچل کر نائٹ کلبوں میں رقص کرتے ہیں، اپاچی ہیلی کاپٹروں سے بیوگی مسلط کر کے اپنی بیوی کے ساتھ سوتے ہیں، زیتون کے باغ تباہ کر کے امن کانفرنسیں کرتے ہیں، فلسطینی بچوں کے سر کا چھت کھنڈر بنا کے بستیاں بساتے ہیں۔ حقیر ہے شیرون، اس کے لیے نہ ابلیس کا لفظ موزوں ہے نہ وحشی، درندہ، نہ خونخوار کا۔ اتنا ظالم نہ مسولینی تھا نہ تھا، نہ فرانکو، نہ ضیا، نہ رضا۔ اسرائیل جیسا بے کلیجہ ملک ، صیہونیت جیسا بے گردہ نظریہ، سامراج جیسا تیرہ و تاریک ضمیر اور فلسطین جیسا مظلوم اب تک تو نہ دیکھا انسانی تاریخ نے ! ۔ نہ ہی اسرائیل جیسے بے چارے عوام، اس جیسا برین واش کیا ہوا عوام، سٹپٹائے ، بے سوچ، بے غم ، بے درد، موت کے سکوت کی طرح خاموش عوام اب تک پیدا نہ ہوا بشر کی تاریخ میں ۔ وہ شیرون کے پیچھے پیچھے ذلت کے سمندر کی طرف جادو

شدہ سدھائے ہوئے بے بھیجہ جانوروں کی طرح رواں دواں ہیں ۔ان کی گرجتی خاموشی تباہ کن ہے ۔ انہیں اٹھنا ہوگا کہ ان کی ذمہ داری سب سے بڑی ہے ۔اسرائیل خود یہودیوں کے لیے موت کا، ظلم کا، دغا کا پھندا بن چکا ہے ۔ جب تک فلسطین آزاد نہیں ہوتا شیرون اور اس کا آقا اسرائیلی عوام کو امن چین اور مسرت نہیں دے سکتا۔ اسرائیلی عوام اور اس کی کمیونسٹ پارٹی کو نہ صرف اپنی فاشسٹ حکومت کا تختہ کرنا ہے ، نہ صرف فلسطین کی آزادی لوٹانی ہے بلکہ خطے کے سارے سلطانوں ، شاہوں سے مشرق وسطیٰ کے عوام کو نجات دلانی ہے۔اس لیے کہ اسرائیل سمیت مشرق وسطیٰ کی ساری حکومتیں بدترین رجعتی حکومتیں ہیں ۔چین ری ایکشن کے بطور پورا خطہ بدل جائے گا، فلسطین کی آزادی سے ۔ اور فلسطین کی آزادی کا حصول پورے عرب عوام کی بادشاہتوں سے آزادی لیے بغیر ناممکن ہے۔

مرحوم مراد ساحر کی نظم ”چیپاں مور“ (گھپ اندھیرا) لکھی تو بلوچستان پہ گئی تھی ۔ جہاں جان لیوا استحصالی زمانہ اختصار کے لفظ سے نابلد ہے، جہاں شہ زوروں جونکوں کی حکمرانی ہے، جہاں میر سردار اور ہستی مند دندناتے پھرتے ہیں، جہاں سرکاری افسر ظلم اور رشوت کی بدنما علامت بن چکے ہیں ، جہاں طالب علم اور استاد فہم میں لاغر مگر جسم میں پہلوان ہیں، جہاں ملّا اور دانشور کانوں سے بہرے، آنکھوں سے اندھے اور زبان سے گونگے ہیں، جہاں کے بزگر چرواہے اور دھقان بے گھر بے نان ہیں، جہاں کی عورت باندی ہے ۔۔۔۔۔ جہاں چیپاں مور ہی چیپاں مور ہے۔
مگر

فلسطین کے غم کے آگے ہمارا غم کتنا بہت کم ہے!!

آنے والے منظروں کے نام

احمد ندیم قاسمی

سنہرے......ڈوبتے سورج نے
قرطاس فلک پر
اک عجب تصویر کھینچی ہے!
مگر تصویر میں جو رنگ برتے ہیں شعاعوں نے
وہ کچے ہیں!
انہیں الفاظ میں محفوظ کر کے
آنے والے منظروں کی نذر کرنا
انتہائے فن پرستی بھی ہے
خلاقی بھی
اور فن کی دیانت بھی
عبادت بھی

جو بادل دُور ہیں
لاکھوں کروڑوں کوس پر ہیں
اور جو نزدیک ہیں
ان کو اگر چُھو لو
تو پوریں رنگ جائیں سات رنگوں میں!

قریب و دور میں جو فاصلہ ہے
اس میں گہرا اور نیلا اور چمکیلا فلک یوں پُرسکوں ہے
جیسے تا حدِ نظر پھیلے سمندر پر سے جب کشتی گزر جائے
تو وہ آسودگی کی سانس لیتا ہے!
جو بادل دُور ہیں
اب تک طلائی تھے مگر اب زرد ہیں
اور جو نزدیک ہیں
اب تک گلابی تھے مگر اب شعلہ وش ہیں
اور نیلا آسماں اب سبز ہے.....
اب سرمئی ہے......
اب فقط لاانتہائی کے خلا کا ایک صحرا ہے
جو بادل زرد تھے
اب کھلتے جاتے ہیں
جو بادل شعلہ وش تھے
بُجھتے جاتے ہیں
ادھر مشرق سے جو سیلابِ شب اُمڈا ہے
سناٹے کی لہروں کی زبانوں سے
گئے خورشید کی اقلیم فن کو چاٹ لیتا ہے
مگر طغیانِ تاریکی کے اس آشوب میں
پہلا ستارہ آسماں پر جب چمکتا ہے
تو وہ اپنی ہنسی پر ضبط کرتا......
نرم سرگوشی میں کہتا ہے
کہ سورج ڈوبتا کب ہے!1

شامِ غم بھی گزر جاتی ہے ایک دن!

راجہ نجیب اللہ خان ستی

اس غمکدہ دہر میں ہزاروں لاکھوں غم ہیں۔۔۔ بلکہ کروڑوں اربوں! نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ان گنت غم۔ انسان کے جسم کا ہر عضو غم سے لبریز! ہر مسام میں غم ہیں۔ ایک وجود ہے اور بے شمار غم۔ غموں سے پروئے ہوئے انسانی وجود۔ غمکدہ جو ہوا! غمکدے میں غم ہی تو ہوتے ہیں اور بھلا یہاں ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آہ مرجھائے ہوئے چہرے اور درد سے ٹوٹتے ہوئے بدن پھر غموں کی یورش میں گھرا ہوا انگ انگ۔

یہ غم کبھی بادلوں کی صورت اپناتے ہیں اور آنکھوں کے راستے برس کر انسانی دل کو پگھلا کر باہر پھینک دینے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی آتشی دھوئیں کی شکل اختیار کر کے اس دل کو راکھ بنا ڈالنے کی سعی کرتے ہیں۔

غموں کے بادل! ہر سانس کے ساتھ غموں کے گہرے کالے بادل جو برسنا چاہتے ہیں پر برس نہیں سکتے۔ افسوس ان بادلوں میں سے ایک بوند بھی باہر نہیں آسکتی۔ یہ بوندیں بے تاب ضرور ہیں آنکھوں کے راستے باہر آنے کے لئے مگر۔۔۔۔۔ رکاوٹ ہے یہ دنیا۔ کونسی دنیا؟ یہی دنیا جو خود غموں کی چار دیواری میں سانس لے رہی ہے۔ وہ اٹھتے بادل وہیں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ پھر اندر ہی اندر دوبارہ غموں کا اکٹھ ہونے لگتا ہے۔ سارا جسم بھر جاتا ہے۔ اندر باہر ہر طرف! دیکھنے والے کی نظر پڑتی ہے تو غم پر، انسانی وجود پر نہیں۔ اگر کبھی کوئی بادل برسنے لگے تو پھر کس کو مجال ہے کہ اسے روک سکے۔ پھر وہ بادل یوں برستے ہیں جیسے کبھی نہیں رکیں گے۔۔۔ لیکن آخر کار رک جاتے ہیں۔۔۔ انہیں رکنا پڑتا ہے۔۔۔ آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ مگر یہ دنیا والوں کے ڈر سے نہیں رکتے بلکہ انہیں خود ہی رکنا ہوتا ہے کیونکہ۔۔۔ جب انسان کا سارا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے باہر آ جاتا ہے تو برسنے کو کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔ پھر بھلا کیا برسے؟ اندر کچھ ہوگا تو برسے گا نا۔ جب سب کچھ بہہ چکا تو پھر بادل تھم گئے۔ ہاں بالآخر بادل تھم ہی جاتے ہیں! پھر خالی سفید بادل دوڑتے پھرتے ہیں ہر سو۔۔۔ کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر تو کبھی خشک صحراؤں کی وسعتوں کے اوپر!

اور غموں کا دھواں! یہ دھواں بڑا کڑوا ہوتا ہے، اتنا کڑوا جتنا سرخ مرچ کو آگ میں جھونکنے سے اٹھتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کڑوا! مرچ سے پیدا شدہ دھواں صرف آنکھوں کو لال کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ آنکھوں کی بینائی متاثر کرتا ہے لیکن غموں کا دھواں تو بذاتِ خود آگ کا ایک پورا الاؤ اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے، اس میں صرف کڑواہٹ ہی نہیں ہوتی بلکہ گرمی بھی ہوتی ہے، حرارت اور برقی تپش بھی ہوتی ہے اور پورے انسانی جسم کو جلا ڈالنے کی طاقت بھی۔ یہ دھواں انسانی جسم کو ایسی راکھ بنا ڈالتا ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی چنگاری نہیں ملتی۔ یہ دھواں ایسی راکھ بناتا ہے جس کو اڑانے سے ہوا بھی انکار کر دیتی ہے۔ جس کو بہانے سے پانی بھی انکار کر دیتا ہے۔ اگر کہیں سے اس راکھ پر کوئی بادل برس بھی پڑے۔۔۔ کونسے بادل؟ وہی غموں کے گہرے کالے بادل۔۔۔ تو اس راکھ کو بہا وہ بھی نہیں سکتے۔ وہ برستے ہیں مسلسل۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ کئی کئی پہر برستے ہیں، مہینوں برستے ہیں، برسوں برستے ہیں لیکن اس راکھ کو وہ کیسے بہائیں جس میں انسانی تمنائیں، ہزاروں ارمان اور ان گنت جستجوئیں جلی ہوئی موجود ہیں۔ یہ راکھ بہنے کی نہیں۔ یہ زمین کے ساتھ چپک جاتی ہے ہمیشہ کے لئے۔۔۔ اور کبھی نہیں اٹھتی۔ پھر خاک اڑتی ہے۔۔۔ کہیں دور پار سے۔۔۔ اور اس راکھ کے اوپر جمنے لگتی ہے۔ بالآخر خاک کی تہہ راکھ کے ڈھیر پر یوں جم جاتی ہے کہ کسی کو کانوں کان اس راکھ کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ لوگ پاس سے گزر جاتے ہیں لیکن انہیں علم ہی نہیں ہوتا کہ اس خاک کے نیچے کتنا بڑا ڈھیر موجود ہے اس راکھ کا۔۔۔ جو انسانی دل کو جلا کر غموں کے آتشی دھوئیں نے بنائی ہے۔ خاک کے نیچے چھپی راکھ کے پاس سے گزرتے ہوؤں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کل ہمارے دل کی راکھ پر بھی اسی طرح مٹی کا نقاب پڑا ہوگا۔

غموں میں گھرے ہوئے انسان نے آخر کچھ تو کرنا ہے۔ وہ بے دست و پا اور بے بال و پر سہی لیکن جب تک سانسیں چل رہی ہیں اور روح اس خاکی وجود میں قید ہے تب تک وہ بھی ان غموں کو بھلانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔۔۔ غموں کو بھلانے کے لئے! مگر بھولتے کب ہیں۔۔۔ ہاں تھوڑی دیر کے لئے! پر تھوڑی دیر کے لئے غموں سے چھٹکارا بہت بڑی دولت ہے۔۔۔ اگر مل جائے تو۔ یہ چھٹکارا ایک پل کے لئے ہی سہی لیکن جلتے وجود اور ڈوبتے جسم کے لئے سکون کا ایک پل بھی لاکھوں کروڑوں صدیوں جتنا ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ راحت کے کئی برس آنکھ جھپکنے جتنی دیر میں گزر جاتے ہیں اور غموں کا ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے لیکن برف کی سلوں تلے یا تندور میں پڑا ہوا جسم سکون کا ایک پل بھی اپنے لئے کافی سمجھتا ہے اسی لئے وہ مختلف طریقوں سے خود کو سکون مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ غموں کو بھولنا چاہتا ہے۔۔۔ پل بھر کے

لئے۔اس ایک پل کو وہ سب کچھ لٹا کر حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے لئے یہ پل بہت قیمتی ہے۔اتنا قیمتی کہ۔۔۔اس اس کے لئے انسان قیمتی سے قیمتی شے بھی لٹا سکتا ہے۔مادی اشیاء میں سے سب سے قیمتی تو انسان کی جان ہے۔۔۔وہ جان بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔۔۔مگر۔۔۔جان تو پہلے ہی جا رہی ہے۔۔۔ غموں کی وجہ سے۔پھر جان کو خطرے میں ڈال کر ایک گھڑی سکون کی خریدنے کو غموں میں مبتلا شخص کوئی گھاٹے کا سودا نہیں سمجھتا کیونکہ وہ تو دونوں صورتوں میں گھاٹے میں ہے۔اگر غم جان لیتے رہیں تو وہ بھی جان کا گھاٹا اور اگر غموں کو بھلانے کے لئے جان کی ڈلی پگھلتی، ڈھلتی، گلتی اور سڑتی رہے تو یہ بھی جانی نقصان۔۔۔لیکن غموں کی سیاہیوں میں ڈوبا ہوا وجود ثانی الذکر نقصان کو ترجیح دیتا ہے۔

دو صورتیں عام ہیں غموں کو بھلانے کے لئے۔پہلی صورت یہ ہے کہ انسان خواندہ ہے اور ادبی ذوق رکھتا ہے۔اس کے پاس قلم ہے، لغت ہے اور لفظوں کے بکھرے موتیوں کو نثر یا نظم میں پرونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔جب غموں کے تلخ برفیلے بادل یا کڑوے گرم دھوئیں اس کے وجود کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں تو وہ قلم کو سیاہی میں ڈبو ڈبو کر غموں کی سیاہیوں پر غلبے کی کوشش کرتا ہے۔اندر کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے وہ مسلسل لکھتا ہے۔درحقیقت غم ادب تخلیق کرتا ہے۔انسان کاغذ پر اپنا غم اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ میں حروف، الفاظ، جملوں، عبارات اور کتابوں کی صورت میں اپنا غم کاغذ کے حوالے کر رہا ہوں اور یہ ہے بھی حقیقت کہ غم بانٹنے سے دل بہل جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ۔۔۔غم زدہ انسان اپنا مال و متاع جام میں گھول کر پی جانا چاہتا ہے۔اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ پینے پلانے سے وہ غموں کی سیاہ پرچھائیوں سے نجات پالے گا۔مے و مینا سے وہ دن رات کھیلتا ہے غموں کو بھلانے کے لئے۔وہ سمجھتا ہے کہ شیشہ و ساغر کے کھنکنے سے بادل چھٹ جائیں گے اور دھوئیں ذرہ ذرہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جائیں گے۔۔۔پر نہ یہ پیمانہ بندوق ہے اور نہ وہ غم خاکی انسان ہیں جو ایک آواز پر ڈر جائیں۔۔۔اور ہر انسان بھی بندوق سے کب ڈرتا ہے۔جب ہر انسان بندوق سے نہیں ڈرتا تو پھر۔۔۔مے کے بوتل سے جام میں گرنے سے ہر غم بھی ڈر کر بھاگ نہیں کرتا۔ہاں بعض غم بعض اوقات یوں مدہوشی کے باعث تھوڑی دیر کے لئے رفع ضرور ہو جاتے ہیں لیکن۔۔۔اس کو غموں کا رفع ہونا تو نہیں کہتے! غم تو وہیں پر موجود ہیں۔۔۔آپ کے پاس، آپ کے دل میں!

غموں کو بھلانے کے لئے آپ کاغذوں کو بیساکھیاں بنائیں یا پیمانے کو عصا بنائیں درحقیقت یہ دونوں بڑے کمزور سہارے ہیں۔غموں کے بادل برسیں تو پیمانے پر خراشیں ڈال دیتے ہیں۔۔۔گہری خراشیں! اور کبھی کبھی تو شیشے کو توڑ دیتے ہیں اور ہر طرف مے؟ لالہ رنگ بکھر جاتی ہے۔۔۔کالے بادل کے سائے تلے سرخ چھینٹے! اور اگر بادل نہ بھی برسیں تو اسے دھندلانے کے لئے ان بادلوں کا سایہ ہی کافی ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف غموں کے دھوئیں اپنے اندر وہ حدت رکھتے ہیں کہ کاغذ کو بھسم کر ڈالتے ہیں۔۔۔ جب کاغذ ہی خاکستر ہو گیا تو کاغذ پر موجود سیاہ موتی بھی کہیں گم ہو جاتے ہیں۔۔۔بہت دور۔۔۔ کاغذوں کی راکھ کے ڈھیر میں۔۔۔نیچے۔۔۔بہت نیچے!

یوں نہ تو لال بوندیں غموں کے بادلوں کو مستقلاً اڑا سکتی ہیں اور نہ ہی سیاہ حروف غموں کے دھوؤں سے فضائے دل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاک کر سکتے ہیں۔۔۔پر غموں کے بادلوں اور غموں کے دھوئیں سے پیدا شدہ شام بھی آخر ڈھل جاتی ہے۔۔۔اُس دن جس دن خاک کا پتلا خاک میں مل جاتا ہے!

زیرِ گرداب

شہزاد

کیا کہیں
کب تھا آساں اُسے بھولنا
مرحلہ بھی تو دشوار تھا
جاں نکلنے کو تھی
جو نکلتی نہ تھی
اُن دنوں
سانس لینا ہمیں بار تھا
بے ثمر برگ تھے
بے اثر رنگ تھے
نہ فضا راس تھی
نہ کوئی بادباں
ساتھ تھا
اک طلاطم رہا
اور بھنور در بھنور
زیرِ گرداب تھے
کب تھیں ترتیب سے دھڑکنیں
دل کسی سوز کا تار تھا
دل تھا یا کوئی انگار تھا
ہم کنارے سے تکتے رہے
وہ تعلق جسے ہم بچا نہ سکے
ڈوب کر مر گیا
ڈور ہوتی تو ہم
کوئی گرہ لگاتے اُسے
ڈوبنے سے بچاتے اُسے
کاش کہتے اُسے
تم کنارے پہ ہو
اور اپنا وجود
زیرِ گرداب ہے...!!!

کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر

شاہ محمد مری

30 جون کے شمارے میں برژنیف اور نکسن کے مذاکرات کا مشترکہ اعلامیہ تفصیل سے دیا گیا (تقریباً ڈیڑھ صفحے)۔ کچھ سائنسی خبریں اور ملک میں پارٹی کی سرگرمیوں کی باتیں ہیں۔مگر مجھے یہ ٹکڑا یہاں دینا ہے:

''سوشلسٹ دانشوروں اور سوشلسٹ کارکنوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کو اُن کے طبقاتی کردار سے آگاہ کریں۔انہیں طبقاتی شعور دیں، انہیں منظّم کریں۔اور اپنے علم سے انہیں لیس کریں تاکہ وہ عمل کے میدان میں اتریں اور پرانے سماج کو ڈھا کر اسے از سرِ نو تعمیر کریں۔ یہ کام خاصا کٹھن ہے۔لیکن اس کام کو کیے بغیر انقلاب کا راستہ ہموار نہیں ہوسکتا۔۔۔۔''

7 جولائی کا شمارہ ایک سرخی لیے ہوئے ہے: نیا سامراجی گٹھ جوڑ۔اس خوبصورت مضمون میں ہمارے خطے میں شاہ ایران کے رول کی تفصیل دی گئی ہے۔ اسے امریکہ کا ٹھیکیدار قرار دیا گیا اور ہمارے خطے میں ہر برائی اور بدقسمتی کا ذمہ دار اسی کو قرار دیا گیا۔ بالخصوص بلوچوں کے لیے۔ وہاں 900 امریکی مشیروں کی موجودگی کا ذکر ہے، اسرائیل کے ساتھ اس کے نفرت انگیز تعلقات کا تذکرہ ہے۔ وہاں امریکی فوجی اڈوں کی بڑھوتری کی بات کی گئی اور پاکستان کے خفیہ اداروں کی تربیت میں ایران کے ہاتھ کا تذکرہ کیا گیا۔

14 جولائی کے شمارے کا اہم عنوان ہے: لیفٹ کسے کہتے ہیں، لیفٹ اتحاد کے کیا معنی ہیں۔

وہ پارٹیاں جو اپنے عمل سے اُن سامراجی اثرات کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد نہیں کرتیں جو عوام پر چھائے ہوئے ہیں بلکہ ان پر پردہ ڈالتی ہیں وہ لیفٹ نہیں ہوسکتیں۔ وہ پارٹیاں یا عناصر جو سوشلسٹ خیالات رکھنے والوں میں انتشار پیدا کرتے ہیں، سوشلسٹ فلسفہ کی تعلیم اور اس کے مطابق نووارد سوشلسٹوں کی تربیت کا فریضہ انجام نہیں دیتے بلکہ سیاست کے بجائے افراد کی تنقید و توصیف کی بکواس سے ان کے ذہنوں کو پریشان کرتے ہیں وہ لیفٹ نہیں بلکہ انٹی لیفٹ ہیں۔وہ پارٹیاں اور عناصر جو بین الاقوامی اور قومی صورت حال اور روزمرہ کے بین الاقوامی اور قومی عوامل کا محنت کش تحریک کے نقطہ نظر سے تجزیہ و وضاحت نہیں کرسکتیں وہ جاہلِ محض ہیں اور وہ محنت کش طبقہ کی راہنمائی کرنے کے اہل نہیں۔ان کا لیفٹ محض فیشن ہے۔اسی طرح وہ افراد یا پارٹیاں جو موقع پرستی کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں وہ کچھ بھی ہوں لیفٹ نہیں۔

21 جولائی 1973 کے شمارے میں بڑا مضمون بھٹو کی حکومت سے یہ مطالبہ تھا کہ ''امریکہ کی حاشیہ برداری چھوڑیئے''۔ ''آئین پر عملدر آمد کا سوال'' اس شمارے کا اداریہ ہے جس میں کہا گیا''۔۔۔ وہ کھیل جو بھٹو نے سرحد و بلوچستان میں کھیلے ہیں اور وہ ظاہر ہے کہ فوجی اور سول نوکر شاہی کے بل پر ہی کھیلے گئے ہیں اُن سے احتراز کرے''۔شمارے میں مزدوروں کی سرگرمیوں کی رپورٹیں ہیں۔

28 جولائی 1973 میں ''مزدور اتحاد کا مسئلہ'' کے عنوان سے ٹریڈ یونینوں کو ایک مرکزی تنظیم میں اکٹھا ہونے کی حمایت کی گئی۔ایک مضمون ممتاز دانشور اور کمیونسٹ راہنما فیروز الدین منصور کے حالات زندگی اور جدوجہد پر ہے۔''افغانستان میں بادشاہت کا خاتمہ'' نامی مضمون 17 جولائی کو سردار داؤد کی جانب سے بادشاہ ظاہر شاہ کا تختہ الٹنے پر لکھا گیا ہے۔''یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ اب بادشاہوں کا دور ختم ہوگیا ہے۔اور افغانستان میں بادشاہت کے خاتمے پر کوئی آنکھ آنسو نہیں بہائے گی''۔

4 اگست 1973 کے شمارے میں ایک فلسفیانہ مضمون ''علم فلسفہ کی تاریخ'' کے عنوان سے ہے۔ مزدوروں کی سرگرمیوں کی رپورٹیں ہیں۔''بلوچستان جلتا ہے'' نامی جالب کا کلام چھپا ہے۔ اور جنگی قیدیوں کے معاملے پر پاک بھارت مذاکرات کرانے کے حق میں مدلل مضمون ہے۔

11 اگست کا شمارہ '' بائیں بازو کے اتحاد کی کوششیں'' کا عنوان لیے ہوئے ہے۔جس میں اتحاد کے لیے کی گئی کوششوں اور ان کی ناکامیوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔اور اس خواہش کا اظہار ہے کہ کوششیں جاری رکھنی چاہییں۔مضبوط نہیں تو کسی الائنس وغیرہ کے امکانات تلاش کرنے چاہییں۔

ایک مضمون 14 اگست کے نام سے ہے جس میں اصل آزادی کے حصول کی بات کی گئی۔ جاگیرداری کے خاتمے کو اِس حقیقی آزادی کی اہم ترین نشانی قرار دیا گیا ہے اور سوشلسٹوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت مزدوروں کسانوں اور محنت کش دانشوروں کو شعوری طور پر متحد اور منظّم کرنے میں صرف کریں۔

18 اگست 1973 کا شمارہ ''پاکستان کے عوام بلوچ عوام سے یک جہتی کا ثبوت دیں''۔ کے اہم موضوع سے چھپا ہے:

''پاکستان کے اس آئین کی مہورت، جس کے متعلق یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ پہلا آئین ہے جو عوام کے نمائندوں نے متفقہ طور پر منظور کیا۔بلوچستان کے معروف رہنماؤں میرغوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل

، خیر بخش مری اور ان کے ان متعدد ساتھیوں کی گرفتاریوں کی صورت میں کی گئی جن کی صحیح تعداداور سب نام ابھی پوری طرح نہیں بتائے گئے ہیں۔ آئین کی یہ مہورت وزیراعظم بھٹو صاحب کی اس جمہوریت کی بھی مہورت ہے جس کا انہوں نے اپنی تقریر میں راگ الاپا تھا جو وزیراعظم منتخب ہونے پر انہوں نے نیشنل اسمبلی میں کی تھی اور حزب مخالف کو افہام وتفہیم کی نصیحت فرمائی تھی اور ساتھ ہی دھمکیاں بھی دی تھیں۔اس کے بعد ہی بلوچستان کے رہنماؤں کی گرفتاریاں اس جمہوریت کے نقوش اور اجاگر کرتی نظر آرہی ہیں جو موجودہ حکومت پاکستان پر مسلط رکھے رہی ہے اور آئندہ بھی رکھنا چاہتی ہے۔وہ بلوچستان میں پیپلز پارٹی کا وجود نہ ہوتے ہوئے ان گرفتاریوں سے صوبائی اسمبلی کی اکثریت کو مقید رکھ کر اور سزائیں دلا کر اپنا وہ راج وہاں قائم رکھنا چاہتی ہے جس کا آغاز اس نے اکثریتی پارٹی کی حکومت کو برطرف کر کے کیا تھا۔اور بڑے جوڑ توڑ اور داؤں گھات سے ایسی حکومت نامزد کر دی تھی جو اسمبلی میں اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔

''حقیقت یہ ہے کہ بھٹو صاحب آج اسی راستے پر گامزن نظر آتے ہیں جس پر جنرل یحیٰی خان ان کے مشوروں کے مطابق یا بغیر مشوروں کے چلے تھے ۔ جو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر رہا سہا پاکستان بھٹو صاحب کی میزبانی میں دے گئے تھے۔ یحیٰی خان نے مشرقی پاکستان کے پاکستانیوں کو فوجی کشت وخون کا نشانہ بنایا تھا۔بھٹو صاحب بلوچستان کے پاکستانیوں کو بناتے رہے ہیں۔

''بھٹو صاحب نے اپنی کارگزاریوں سے صرف بلوچستان کے عوام کو ہی نہیں تمام پاکستان کے عوام کو انتہائی مایوس کردیا ہے کیونکہ اول تو ان کے انتخابی نعروں کا پول کھل کر وہ بےنقاب ہوئے تھے اور اب یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ ان کا ہر قدم اور ہر پالیسی صرف عوام دشمنی کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکمران بورژوا عوام کے استحصال اور لوٹ کو برقرار رکھنے کے لیے چولے بھی بدلتا ہے مطلب برآری کے نئے جھوٹ بھی بولا کرتا ہے اور فریب سے بھی کام لیتا ہے اس کے باوجود فریب خوردہ عوام کچھ اس کا موثر اور فیصلہ کن جواب دینے سے بھی ہچکچاتے رہتے ہیں۔لیکن جب حکمران بورژوازی کو حسب جاہ ودولت دیوانہ بنا دیتی ہے اور وہ خود ملک کو داؤ پر لگا دیتی ہے تو عوام کی ہچکچاہٹ اور تذبذب کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔بھٹو کی حکومت نے بلوچ رہنماؤں کو گرفتار کر کے اس بند کو توڑنے کا اقدام کیا ہے اور اپنے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑکانی ہے۔

''یہ بھی حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالنے سے آج تک صوبائی اور علاقائی مصیبتوں کو ہتھیار بنا کر پنجابیوں کو پختونوں ، بلوچوں اور سندھیوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی اور عوام کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے متواتر جتن کئے جس کا ثبوت ان کی پارٹی اور ان کی پارٹی کے گورنرز کا وہ عمل ہے جس میں حزب مخالف کے روالپنڈی والے جلسے کو پنجابیوں پر پختونوں کی چڑھائی قرار دے کر خون میں ڈبو دیا گیا۔دوسرا ثبوت بلوچستان میں فوجی اقدامات اور بلوچستان کی برطرف شدہ منتخب حکومت کے ارکان کو بہتام طرازیوں سے رسوا کرنے کی کوششوں سے ملتا ہے اور ایسی ہی وہ کاروائیاں بھی اس کا ثبوت ہیں جو سندھ میں وہاں کی صوبائی حکومت کر چکی ہے اور کرتی رہتی ہے۔

''پاکستان کے نئے آئین کے نفاذ سے عوام کو توقع تھی کہ ملک ہنگامی حالت کی قابل نفرت ودلدل سے نکلے گا۔سیاسی کارکن ،طلبا اور مزدور رہنما جیلوں سے نکلیں گے ۔ متشدد قوانین واپس لیے جائیں گے، پریس کو حکومت کی غلامانہ اور منافقانہ چاپلوسی سے نجات ملے گی ۔ سیاسی پارٹیوں کے جلسے فیڈرل پولیس اور پیپلز پارٹی کے زرخرید غنڈوں کے حملوں سے محفوظ ہوجائیں گے اور سیاسی سماجی زندگی آزادی سے اپنی جمہوری قدروں کو بروئے کار لا سکے گی۔اور اس سب کے نتیجے میں عوام کے وہ مسائل جو بھوک ، بے روزگاری اور گرانی کی صورت میں عوام کا کچومر نکال رہے ہیں ان کے حل کرنے کا سوال زیرِغور آئے گا۔لیکن آئین کے نفاذ کے فوراً بعد بلوچستان کے رہنماؤں کو لایعنی الزامات کے بہانے سے ایسے وقت میں گرفتار کر کے جب کہ تباہ کن سیلاب سے پیدا ہونے والے مسائل اور اس ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تمام نکتہ خیال کے لوگوں کے اشتراک اور اتحاد کی ضرورت تھی بھٹو صاحب کی حکومت نے عوام کے مسائل اور تازہ مشکلات کو حل کرنے کے بجائے نہایت غلط جوا کھیل کر ملک کو نہایت نازک اور خطرناک صورت حال سے دو چار کردیا ہے ۔ بھٹو صاحب کا یہ عمل نیا نہیں وہ تو اس راہ پہ پہلے سے گامزن ہیں۔ سیاسی مسائل کو پیدا کرنا اور الجھا کر معاشی اور سماجی مسائل کو پس پشت ڈال دینا ان کا متواتر عمل رہا ہے۔ان کا یہ عمل وزیراعظم بننے کے بعد سے نہیں ہے بلکہ اُس وقت سے ہے جب سے کہ انہوں نے اقتدار کی کنجیاں اپنے پرانے رفیق جنرل یحیٰی خان سے لیں۔اور اپنی جیب میں ڈال لیں۔اس لیے پاکستان کے تمام عوام اور بالخصوص محنت کش عوام کے سامنے یہ سوال ایک بڑے استفہامیہ کی صورت میں آ گیا ہے کہ کیا وہ بھٹو صاحب کے اعمال اور بالخصوص تازہ غیر جمہوری قابل مذمت وملامت اس عمل کی مذمت کر کے ہی چپ ہو جائیں جو انہوں نے جمہوریت کو دفن کرنے کے لیے کیا ہے اور اس سے پہلے کرتے رہے ہیں ،یا ان کے خلاف ایسے موثر اقدام کریں جن کے نتیجے میں پاکستان کو پیپلز پارٹی کے پیدا کردہ گرداب سے نکالا جا سکے اور عوام کے

معاشی اور سماجی مسائل کے حل کرنے کی راہ کھلے۔

''ان قابل نفرت دیواروں کو مسمار کرنے کے لیے درہ خیبر سے کراچی کے کلفٹن تک پاکستان کے محنت کش عوام مزدوروں، کسانوں، طلباء اور دانشوروں اور تمام سیاسی کارکنوں کو ان جمہوریت کش اقدامات کی مذمت کرنی چاہیے۔ نیز بلوچستان کے تمام جائز اور جمہوری حقوق کی بحالی کا مطالبہ کر کے بلوچستان کے عوام کو اپنے تعاون، ہمدردی اور یک جہتی کا یقین دلانا چاہیے اور اس مطالبے پر بھی پیہم زور دینا چاہیے کہ ملک سے ہنگامی حالات ختم کیے جائیں، تمام سیاسی کارکنوں، مزدور رہنماؤں اور طلبا کو خواہ انہیں سزائیں مل گئی ہیں یا نظر بند و پابند ہیں جیلوں سے نکالا جائے۔ اور بلوچستان میں پھیلائی ہوئی فوجوں کو بیرکوں میں واپس لایا جائے۔ جن ذمہ دار افسروں نے بلوچستان کے عوام پر تشدد کیا ہے ان کو عدالت ہائے انصاف کے سامنے پیش کیا جائے۔ عوام کو بھٹو صاحب کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ وہ اگر انہیں تختِ حکومت پر بٹھا سکتے ہیں تو انہیں اس پر سے اتار دینے کی قدرت بھی رکھتے ہیں!''۔

25 اگست کا شمارہ ''تاریخی ضرورت'' کے عنوان سے ایک فلسفیانہ مضمون ہے۔ ''اسی طرح سیلاب اور حکومت کی نا اہلی'' پر بھر پور لکھا گیا مضمون ہے۔ راولپنڈی پارٹی کے اجلاس کی رپورٹ اور قراردادیں ہیں۔ ایک قرارداد میں کہا گیا کہ''۔۔۔ بلوچستان کا مسئلہ ایک سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور یہ معاملہ اب جمہوریت کے مسئلہ سے بڑھ کر ملکی سالمیت کا مسئلہ بن رہا ہے۔ یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ بلوچستان کی غیر نمائندہ حکومت اور گورنر کو برطرف کیا جائے، وہاں سے فوج واپس بلائی جائے اور وہاں کے منتخب لوگوں کی حکومت بحال کی جائے۔

آج کی ہزارویں سالگرہ پر؟!

کاوش عباسی

کسی کلچر میں
کسی زندہ کو
ایسے ظلم سے
پتھر، اینٹیں، لکڑیاں، لاتیں
مار مار کے
مارنا ہم نے
نہیں سُنا
انساں کو نہیں
حیواں کو نہیں
جیسا اُنہوں نے
اُسے
مارا، پچھاڑا
پتھر، اینٹیں، لکڑیاں، لاتیں
گھنٹہ دو گھنٹہ
مارتے مارتے تھک گئے تھے
وہ مرتا نہیں تھا
جبڑے، گال، آنکھیں اُس کی
پھٹ ٹوٹ گئے تھے
کھوپڑی چٹخ چکی تھی
سارا جسم ہی اُسکا بگڑ چکا تھا
لیکن وہ مر نہیں رہا تھا
اور دِلوں میں آگ اتنی تھی
گولی چلائی
ٹھنڈا ہوا وہ
اَب اُس کے مُردے کو
مارنا، کُوٹنا
اُس پر
ناچنا، کُودنا
نعرے لگانا
اِس سے بھی وہ تھک گئے تھے
تھک جیت کے
اپنے اپنے گھر کو گئے
نہائے
کھانا کھایا
رات آئی تو
ساتھ اپنے ماں باپ کے
(آنکھیں نیچی کیئے ہوئے
سینے میں سُوَر چھپائے ہوئے)
اور بھائی بہن کے
سوئے
کل سے اُن کے باپ بھی
اِدھر اُدھر
افسروں سے مِلنے نکلیں گے
سب مِل کر
اپنے اپنے جُھوٹ کو پختہ کریں گے۔

حیواں کو بھی
کھانے کے لئے کاٹنا ہو تو
تیز چُھری سے کاٹتے ہیں
ہاں
مذہب میں ہے
حیواں کو بھی ذبح کرو تو
کُند چھری سے مت کاٹو
بیچارے کو تکلیف نہ ہو
فوراً مر جائے۔
(مشال خان کے, جدید عہد میں قبائلی نظام
کے, نام)

پولیٹیکل اکانومی (علم المعیشت)

سی، آر، اسلم

سماجی زندگی اشیائے ضرورت کی پیداوار کے بغیر ناممکن ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے خوراک ، پوشاک اور دوسری مادی اشیاء کی ضرورت ہے ۔اور خوراک اور پوشاک اوردوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیےانہیں کام کر کے اپنی محنت سے ان اشیاء کو پیدا کر نا پڑتا ہے ۔ اور انسان ان اشیاء کی پیداوار ہمیشہ اور ہر حالت میں مل جل کر کرتے ہیں۔

اشیاء کی پیداوار اور مادی دولت کی پیدا وار کے لیے مندرجہ ذیل عوامل کا ہونا ضروری ہے۔

1۔ انسانی محنت

2۔ ذرائع پیداوار

3۔ آلاتِ محنت

جب تک یہ تینوں موجود نہ ہوں پیداوار کا عمل جاری نہیں ہوسکتا۔

انسانی محنت

انسان کا وہ با مقصد عمل ہے جس کے دوران وہ قدرتی ذرائع پیداوار کواس طرح تبدیل کرتا اور گھڑتا ہے کہ اُن سے اپنی ضروریات زندگی کی تسکین کر سکے۔انسانی زندگی کی بقاء کے لیےمحنت لازمی شے ہے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی کی بقاممکن نہیں ہے ۔انسان اپنی محنت سے خام مال کو تیار مال کی صورت میں تبدیل کرتا ہے ۔خام مال وہ اشیاء ہیں جنہیں انسان اپنی محنت سے قدرتی وسائل میں سے حاصل کرتا ہے ۔مثلاًوہ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاتا ہے،کھیتوں میں کپاس اگاتا ہے،اور پہاڑوں سے معدنیات نکالتا ہے ۔عمارتی لکڑی اور کانوں سے نکالی ہوئی معدنیات اور کھیتوں میں پیدا کی ہوئی کپاس وہ خام مال ہے جسے وہ اپنی محنت سے موٹروں ، کپڑوں اور فرنیچر کی صورت دیتا ہے۔

آلاتِ محنت

یہ پیداواری آلات ہیں جن کی مدد سے انسان قدرتی وسائل سے خام مال اور پھر خام مال سے تیار مال حاصل کرتا ہے۔ان میں پیداواری عمل کو جاری کرنے کے لیے جس زمین اور عمارت کی ضرورت ہے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔وہ گودام بھی شامل ہیں جہاں خام مال اور تیار مال رکھا جاتا ہے ۔اور سڑکیں ریلیں ،نہریں بھی شامل ہیں جن سے ایک جگہ سے دوسری جگہ وہ منتقل کیا جاتا ہے۔ان سب میں بنیادی اور فیصلہ کن کردار پیداوری عمل میں آلاتِ پیداوار کو حاصل ہے۔ آلاتِ پیداواروہ آلات ہیں جنہیں انسان پیداوری عمل میں اپنے کام میں لاتا ہے۔

ذرائع پیداوار، آلات پیداوار اور وسائل پیداوار ازخود پیداوارنہیں کر سکتے۔ پیداوار کے لیے وہ انسانی محنت کےمحتاج ہیں۔اور جب تک انسانی محنت آلاتِ پیداوار کوحرکت میں نہیں لاتی وہ بیکار رہتے ہیں ۔ان دونوں کا ملاپ ہی حرکت پیدا کرتا ہے۔

انسانی محنت آدمی کی کام کرنے کی جسمانی اور ذہنی استعداد کو کام میں لاکر ہی انسانی ضرورت کی چیزیں پیدا کرسکتی ہے ۔ پیداوار کے لیے اصل قوت انسانی محنت ہے جو ذرائع پیداوار کوحرکت میں لاتی ہے ۔انسان نے آلاتِ پیداوار بنائے ہیں۔اوران آلات کو بنانے اور کام میں لانے کے عمل میں اس کے کام کرنے کی صلاحیت ،استعداداور ہنرمندی میں ترقی ہوتی ہے۔اس کی عادات بدلتی ہیں۔اوراس کے نظریات اور تصورات بدلتے ہیں۔

آلاتِ پیداوار اوران کو کام میں لاکر اشیا کو پیدا کرنے والے انسان یعنی محنت کش (مزدور اور کسان)ہی سماج کی پیداواری قوتیں ہیں اورانسانی سماج کے تمام ادوار میں محنت کش ہی اس کی بنیادی قوت رہے ہیں۔

انسان پیداواری عمل میں ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں ۔اور یہ تعلقات اور رشتے ''پیداواری رشتے'' کہلاتے ہیں۔ان رشتوں میں وہ ایک دوسرے سے بندھ جاتے ہیں۔

پیداواری رشتوں کا کریکٹر جاننے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ ذرائع پیداوار کا مالک کون ہے۔کیا ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں ہیں؟۔یا تمام سماج کی ملکیت میں ہیں؟۔پہلی صورت میں ذرائع پیداوار کا مالک طبقہ اپنی ملکیت کے سہارے محنت کولوٹتا ہے۔اور دوسری صورت میں ذرائع پیداوار کو تمام انسانوں کی مادی اور ثقافتی ضروریات کی تسکین کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔پیداواری رشتوں کے کریکٹر سے پیداوار کی تقسیم کا کریکٹر بنتا ہے ۔اگر ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں ہوں گے تو ان کی پیداوار نجی ہاتھوں میں جائے گی اوراسے منافع خوری کے لیے کام میں لایا جائے گا۔اور اگران کی ملکیت سماجی ہوگی تو پیداوار کی تقسیم سب انسانوں میں ہوگی۔

پیداوار کی تقسیم جو پیداوار اور استعمال کے درمیان ایک کڑی ہے،اس کی کا کریکٹر پیداواری رشتوں کے کریکٹر جیسا ہوتا ہے۔اگر پیداواری رشتوں پر نجی ملکیت ہوگی تو پیداوار کی تقسیم پر بھی اس کی چھاپ ہوگی ۔

پیداوار دو کاموں کے لیے استعمال میں آتی ہے: ذاتی استعمال میں،اور پیداواری استعمال میں ۔انسان پیداوار کو ذاتی استعمال لاکر اپنی خوراک ،پوشاک اور دوسری ضرورتیں پوری کرتا ہے اور

پیداواری استعمال میں لا کر مزید مادی دولت پیدا کرتا ہے۔

سرمایہ داری سماج میں ذرائع پیداوار پر سرمایہ داروں کی نجی ملکیت ہوتی ہے۔اس لئے پیداوار کے بھی وہی مالک بن جاتے ہیں۔ مزدور ذرائع پیداوار سے محروم ہونے کی وجہ سے بھوک سے مجبور ہو کر سرمایہ داروں کے ہاتھ اپنی محنت اور قوتِ محنت فروخت کرتے ہیں۔سرمایہ دار اُن کی قوتِ محنت سے پیدا کی ہوئی پیداوار کو ہتھیا لیتے ہیں۔اس کے برعکس کمیونسٹ سماج میں ذرائع پیداوار کی سماجی ملکیت ہوتی ہے اور مزدور جو کچھ اپنی قوتِ محنت سے پیدا کرتے ہیں اُسے لوٹنے والا کوئی نہیں ہوتا۔وہ خود ہی اس کے مالک ہوتے ہیں۔

اشیاء کی پیداوار،تقسیم،تبادلہ اور استعمال میں پیداوار کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔تقسیم ،تبادلے اور استعمال کی صورتیں پیداوار پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔کبھی یہ صورتیں پیداوار کی ترقی کا سبب بنتی ہیں اور کبھی اس کی ترقی میں مزاحمت کرتی ہیں۔

سماج کا معاشی ڈھانچہ پیداواری رشتے ہیں جو سماج کی بنیاد ہیں۔اس بنیاد پر قانونی اور سیاسی جماعت بنتی ہے۔اور اس سماجی شعور کی مختلف صورتیں اس کے مطابق بنتی ہیں۔یہ اوپری عمارت (ڈھانچہ) ایک دفعہ وجود میں آنے کے بعد سماج کی معاشی بنیاد پر اثر انداز ہوتا ہے۔یعنی یا تو معاشی ترقی میں مددگار ہوتا ہے یا اس کی مزاحمت کرتا ہے۔

پیداوار کے دو رخ ہیں۔ایک فنی اور دوسرا سماجی۔فزکس،کیمسٹری،اور انجنیئرنگ اس کے فنی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔اور پولیٹیکل اکانومی اس کے سماجی پہلو سے۔

پولیٹیکل اکانومی کا تعلق پیداوار سے نہیں بلکہ اس کا تعلق پیداواری عمل کے دوران آدمیوں کے درمیان قائم ہونے والے پیداواری رشتوں سے ہے۔

کسی ملک کا نظامِ پیداوار دو چیزوں سے مل کر بنتا ہے: پیداواری طاقتوں اور پیداواری رشتوں سے۔ان دونوں میں سے پیداواری قوتیں زیادہ متحرک اور توانا ہوتی ہیں۔آلاتِ پیداوار میں تبدیلی ہی سے پیداوار میں ترقی ہوتی ہے۔پیداواری قوتوں میں تبدیلی اور ترقی پیداواری رشتوں کے اندر ہوتی ہے۔لیکن ایک منزل پر پہنچ کر پیداواری قوتیں پیداواری رشتوں سے آگے بڑھ جاتی ہیں اور پیداواری رشتے ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ قدیم پیداواری رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے پیداواری رشتے لے لیتے ہیں اور سماج کی معاشی بنیاد بدل جاتی ہے۔معاشی بنیاد میں تبدیلی آجانے سے سماج کی اوپری عمارت (ڈھانچہ) بھی بدل جاتی ہے۔

سماج کی ترقی کا معاشی قانون پیداواری قوتوں سے پیداواری رشتوں کی جبری مطابقت ہے۔

طبقاتی سماج میں پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کا تصادم طبقاتی جدوجہد کی صورت اختیار کرتا ہے۔اور پرانے نظامِ پیداوار کی جگہ نیا نظامِ پیداوار سماجی انقلاب سے قائم ہوتا ہے۔

ہر نظامِ پیداوار کے اپنے معاشی قوانین ہیں جو انسان کی مرضی اور منشا سے آزاد ہوتے ہیں۔انسان انہیں دریافت کرسکتا ہے اور سماج کی ترقی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کام میں لاسکتا ہے۔ لیکن جب تک معاشی نظام قائم ہے ان قوانین کو کالعدم نہیں کیا جاسکتا۔

اب تک انسانی سماج پانچ نظام ہائے پیداوار سے گزرا ہے یعنی:

1۔قدیم کمیونسٹ نظامِ پیداوار

2۔غلام داری سماج کا نظامِ پیداوار

3۔جاگیرداری کا نظامِ پیداوار

4۔سرمایہ داری نظامِ پیداوار

5۔کمیونسٹ نظامِ پیداوار

فلسطین

توفیق زیاد/احمد ندیم قاسمی

یہ کہیں زیادہ آسان ہے
کہ سوئی کے ناکے میں سے ایک ہاتھی گزار لیا جائے
یا ایک بھنی ہوئی مچھلی جال میں پھنسالی جائے
یا سمندر میں ہل چلایا جائے اور فصل اُگائی جائے
یا مگرمچھ بولنے لگے
خیال کی ایک چنگاری کو بجھانے کے مقابلے میں
یا ہمیں اس مقام سے ایک بال برابر ہٹانے کے مقابلے میں
جو ہم نے منتخب کر رکھا ہے
یہ سب کچھ کہیں زیادہ آسان ہے
ہم تمہارے سینوں پر چٹانوں کا بوجھ بن جائیں گے
ہم بھوکے رہیں گے
ننگے رہیں گے
مگر شکست نہیں مانیں گے
ہم اپنی نظمیں گائیں گے
ہم گلیوں کو اپنے مظاہروں سے بھر دیں گے
ہم جیل خانوں کو اپنے پندار سے بھر دیں گے
ہم خوددار بچوں کی ایک نسل کے بعد دوسری نسل پیدا کرتے جائیں گے

ریاست و انقلاب

شاہ محمد مری

بالغیں مارکسزم ءِ سری سری کتاب ۔۔۔’’فلسفہ ءِ نیزگاری‘‘ او کمیونسٹ مینی فیسٹو ’’۔۔۔۔1848 ءِ انقلاب بہ وختا دیما آتکغنت ۔ ہمے سببا مارکسزم ءِ عمومی اصولانی پیش دارغا بید، آں یک حدے آداں وخت ءِ سرجم ایں انقلابی صورتِ حالہ ڈس انت ۔ اے خاطرا اے گندغ شاید زیات مناسب بی کہ ہمے کتابانی مصنفاں 1848-51 ءِ سالانی تجربہ آژہ ہر نتیجہ اے کہ کشتہ شما نہیا دروکا پیشا ریاستہ بارواچے گوئشتہ ۔

’’فلسفہ ءِ نیزگاری‘‘ اندرا مارکسا لکھشہ ۔

’’۔۔۔۔رزودم ءِ دورانا، مزدور طبقہ کہنیں بورژوا سماجا یک ہمنگیں ایسوی ایشن اے ءَ گوں بدل کنت آں کہ طبقہ آں او آنہانی دژمنی آں ختم کنت کشی درءَ ستّی ،او ہموذا ہچ سیاسی پاور گروپ سرنہ یا انت ،اے خاطرا کہ چڑو سیاسی اقتدار بورژوا سماجہ اندرا دژمنی ءِ تضاد ءِ آفیشل اظہاریں‘‘۔ (صفحہ 182، جرمن ایڈیشن،1885)۔

طبقہانی ختم بیغا رند ریاست ءِ غائب بیغہ خیال ءِ ہمے عمومی تفصیل ءِ موازنہ ’’کمیونسٹ مینی فیسٹو‘‘ اندر ءِ تفصیلا گوں سبق آموز بی ، کہ مارکس و اینگلزا چی اے ماہ رندا بزاں نومبر 1847 آ لکھا اثغث :

’’۔۔۔۔ پرولتاریہ ءِ رزدم ءِ کلاں ژہ زیات عمومی مرحلہ آں بیان کناناں، ماگھٹ یا زیات اوڈھریں سول وار ءِ نشان دیشغنت، اسّتیں سماجہ اندرا زہر و غضب داں ہماں حدا پجشہ اوذ کہ جنگ گوانک چیکی انقلابہ صورتا چھڑی ، او ہموذ کہ تشددا گوں بورژوازی ءِ تختہ چپی کنغ پرولتاریہ ءِ حکومت کنغا پہ بنیاد ءَ اِیر کنت ۔۔۔

’’۔۔۔۔ ما بڑزا دیشہ کہ مزدور طبقہ ءَ پلوا اژہ انقلاب ءِ سری گام اے بی کہ آں پرولتاریہ آ حکمران طبقہ ءَ حالتا داں بڑز کنت تا کہ جمہوریت ءَ جنگا کٹی ۔

’’ پرولتاریہ وتی سیاسی بالادستی ءَ بورژوازی ءَ ژہ دارہیں کپٹل (درجہ بہ درجہ) ءِ پلغ ءَ پہ استعمال کنت ، پیداوار ءِ سجہ ایں سندراں ریاستہ دستاں نزکاری بزاں پرولتاریہ ءِ دستاں کہ حکمران کلاسہ ڈولا منظّم بیثی ایں ، او ہر چی کہ اشتافی بیثہ بی سجہ ایں پیداواری قوتانی گیش کنغا پہ گزرءَ کنت (پہتمی جرمن ایڈیشن 1906 ۔تاک 31، او37)۔

ایذا مار ریاست ءِ سرحالہ چکا مارکسزم ءِ یک کلاں ژہ اہم او زبردستیں خیالے یک فار مولائے ڈول ءَ دست کفی بزاں ’’ پرولتاریہ ءِ ڈکٹیٹرشپ‘‘ ءِ خیال (مارکس و اینگلزا ہمے نام پیرس کمیونا رندا گزرکنغ شروع کشہ) ، او اے دِہ کہ ریاست ءِ یک باز دلچسپ ایں ڈیفی نیشن اے دِہ دست کفی ، کہ آں دِہ مارکسزم ءِ ’’شموشتغیں لفظاں‘‘ ژہ یکے: ’’ریاست بزاں حکمران کلاسہ ڈولا آرگنائز بیثغیں پرولتاریہ‘‘۔

آفیشل سوشل ڈیموکریٹک پارٹیانی رائج ایں پروپیگنڈہ، او ایجی ٹیشن ءِ لٹریچرءَ اندرا ریاست ءِ ہمے ڈیفی نیشن ءِ ہچبر وضاحت نہ ویشہ ۔ بلکہ اے ہانسکار نظر انداز کنغ بیثہ ، اے خاطرا کہ اے اصلاع پسندی (ریفارمزم) آ گوں ہچبر صُلُح ءَ نہ خنت او ’’جمہوریت ءِ ، پرامن ایں رزدوم‘‘ ءَ بارہا اپر چونسٹ تعصب او فلسٹین ایں واہمہ آنی بُوتا یک پچماٹے ۔

پرولتاریہ آ ریاست ءِ ضرورت ایں ۔۔۔ سجہ ایں اپرچونسٹ ،سوشل شاونسٹ ، او کاوتسکی والا دھک مس دھکی ہمے ٹوکہ کن انت ۔ آں مار تسلی ءَ دینت کہ اے مارکس ءِ سبق اے ۔ پر آں اشی اندرا اے ٹوک ءَ وڈّھینغ ءَ ’’شموشنت‘‘ کہ اول تہ مارکسہ خیال اث کہ، پرولتاریہ آ چڑو ہمنگیں ریاستے گزریں آں کہ رفتہ رفتہ گار بیغیں ، بزاں ریاست ءِ تشکیل اے رنگا بیثہ ، کہ آں یکدم رفتہ رفتہ گار بیغہ شروع کنت ، لازماً رفتہ رفتہ ای مرغی ایں نِیں ۔ او دوہمی اے ، کہ پورہاتی ایں مخلوکا یک ’’ریاستے گزریں ، بزاں ’’حکمران طبقہ ءِ حیثیتا منظّم بیثغیں پرولتاریہ‘‘۔

ریاست طاقت ءِ یک سپیشل ایں تنظیم اے ۔ اے یک کلاسے لتاڑغا پہ تشدد ءِ یک تنظیم اے ۔ پرولتاریہ آ تاں کلاس لتاڑغی؟ ۔ قدرتی ٹوکے، کہ چھڑو استحصالی طبقہ بزاں بورژوازی ۔ پورہاتی مخلوقا ریاست چھڑو استحصالی آنی مزاحمت ءِ چیتاڑغا پہ گزریں ، او چھڑو پرولتاریہ ہمے چیتاڑغ ءِ راہ شونی ءَ کشہ کنت ، اشیا پیلہ کشہ انت ۔ اے خاطرا کہ پرولتاریہ ہماں واحدیں طبقہ ایں کہ ثابت قدمی آ گوں انقلابی ایں، ہماں واحدیں طبقہ ایں کہ بورژوازی خلافا سٹرگل ءَ اندرا، اشیا پیلوی ءَ تبدیل

کنغ ئے سٹرگل ءَ اندرا سجہ ایں پورہاتی او استحصال بیثغیں مخلوق ءَ متحد کشہ کنت ۔

استحصالی طبقہ آ استحصال جاری دار غا پہ سیاسی اقتدار گزریں، بزاں سجہ ایں مخلوق ئے مزائیں اکثریتہ خلافا یک غیر اہم ایں اقلیتے ئے خودغرضیں مفادانی برجاہ دار غا پہ۔ استحصال بیوخیں طبقہ آں سجہ ایں استحصال ئے پیلوی آ ختم کنغا پہ، بزاں عوام ئے مزائیں اکثریت ئے مفادا پہ، او جدیدیں غلام واثہ بزاں جاگیردار و کپٹلسٹانی بازکستر ڑوئیں اقلیتے خلافا سیاسی اقتدار گزریں۔

پیٹی بورژوا ڈیموکریٹا ں، ہماں نقلی سوشلسٹاں کہ کلاس سٹرگلہ ہندا کلاس مصالحت ئے وہاو آڑتغنت اش، حتی کہ سوشلسٹ ٹرانسفارمیشن یک وہاو او خیالی ایں طرزے آ پیش داشتیش ۔۔۔ استحصالی طبقہ ئے حاکمی چپی کنغا گوں نہ، بلکہ اقلیت ئے اکثریتہ اگھا پرامن ایں فرمانبرداری آں گوں کہ وثی مقصدانی باروا شعور والا بیثغنت ۔ ہمے پیٹی بورژوا یوٹوپیا، لازمی صورتا اے خیالا گوں لگڑتی ایں کہ ریاست طبقہ آں ژہ بڑز ترایں، اشیا عملی ڈولا مزدور طبقہ ئے مفاداں گوں غداری کنغ ئے عمل ءَ راہنمائی کشہ چوکہ 1848، او 1871 ئے، فرنچ ریوولیوشن ئے تاریخا ڈسثغ اث، او صدی ئے آخر ابرطانیہ، فرانس، اٹلی او دوہمی ملکانی اندرا بورژوا کیبنٹ آنی اندرا ''سوشلسٹ'' حصہ داری ئے تجربہ آ گوں ڈسثہ۔

مارکس وثی دراہیں زیندھا ہمے پیٹی بورژوا سوشلزمہ خلافا مڑثہ، کہ نیں روسہ اندرا سوشلسٹ انقلابی او مانشویک پارٹی آنی اندرا اغدّہ زیندغ بیثہ ۔ آنہیا استقامتا گوں وثی طبقاتی جھدءَ تھیوری ترقی دیاناں بڑتہ، داں سیاسی اقتدار ئے تھیوری آ، ریاست ئے نظریہ آ۔

بورژوا حکمرانی ئے تختہ چھڑو پرولتاریہ چپی کشہ کنت، ہماں خاصیں طبقہ کہ آنہی وجود ئے معاشی حالت اشیا ہمے کارءَ واسطا تیار کنت او راشیا ہمے کار ءَ کنغا پہ امکان او طاقتہ دینت ۔ وختیکہ بورژوازی، راہک او سجہ ایں پیٹی بورژوا گروپاں بھورینی او کنٹروکنٹروکنت، آں پرولتاریہ آ مضبوط کنت، متحد کنت او منظّم کنت ۔ چھڑو پرولتاریہ، کہ مزائیں پیمانہ ئے پیداوارءَ اندراوثی معاشی کردءَ سببا، سجہ ایں ورکنگ او راستحصال بیثغیں مخلوق ئے لیڈر بیغ ءَ لائخا ایں، ہماں مخلوک ئے کہ بورژوازی استحصالہ کنت اش، لتاڑی او چیتاڑی ثش، پر آں وثی نجاتا پہ یک آزادیں سٹرگل اے شروع کنغہ لائخا نہ ینت ۔

ریاست او سوشلست انقلاب ئے معاملہ ءَ چکا مارکس ئے گزرکثغیں طبقاتی جھدءَ تھیوری لازمی صورتا پرولتاریہ ئے سیاسی حاکمی ئے تسلیم کنغہ پلوا بارٹت، اشی ڈکٹیٹرشپ ءَ پلوا، یعنی سالم و سرجمیں اقتدار کہ براہ راست عوام ئے مسلح قوت پشتا جکثی ایں نیں۔ بورژوا زی ئے تخت ءَ چپی کنغ چھڑو پرولتاریہ ئے حکمران طبقہ بیغا گوں بیثہ بی، کہ بورژوازی ئے لازمی او سختیں مزاحمت ءَ چیتاڑغ، او نوخیں معاشی نظاما پہ سجہ ایں مزدور او استحصال بیثغیں عواما منظّم کنغا گوں حاصل کشہ کیث ۔

پرولتاریہ آ طاقت ئے سنٹرلائزڈ تنظیم، تشدد ئے تنظیم یعنی ریاست گزریں تا کہ دوئیں کاراں کنت: استحصالی آنی مزاحمتا چیتاڑی، او یک سوشلسٹ معیشت اے منظّم کنغ ئے کارءَ اندرا آبادی ئے بازمزنیں اکثریت ئے (راہک، پیٹی بورژوازی او نیم پرولتاریہ ئے) راہنمائی ءَ کنت ۔

مزدورانی پارٹی آ ایجوکیٹ کناناں مارکسزم پرولتاریہ ئے وین گارڈ (ہراول دستہ) ءَ ایجوکیٹ کنت، کہ اقتدارہ سنبھالغ ئے او سجہ ایں پرولتاریہ ئے سوشلزمہ پلوا راہنمائی کنغ ئے لائخ اَیں، نوخیں نظامہ راہبری او منظّم کنغ ئے لائخ اَیں، ٹیچر بیغ، گائیڈ بیغ، سجہ ایں پورہاتی ایں عوام او استحصال بیثغیں مخلوقا بورژوازی آ بغیر او بورژوازی خلافا وثی سماجی زیندھہ آرگنائز کنغا اندرا، لیڈر بیغہ لائخ ایں۔ اشی برخلاف نی ایں زوراخیں اپرچونزم مزدورانی پارٹی ئے ممبراں جوائیں پگھار والی مزدورانی نمائندگانی ڈولہ تربیتہ کنت، آں کہ عواما گوں نزدیک نہ ونت کپٹلزمہ شیرا بازجوانی آ ''چل انت''، او وثی سری سری پیدائشی حقا نغن ئے یک زمبے آ پہ شوشکنت، بزاں بورژوازی خلافا انقلابی لیڈرانی حیثیتا وثی کردا ژہ دستبردار بی انت۔

''ریاست، بزاں حاکمیں طبقہ اے حیثیتا آرگنائز بیثغیں پرولتاری'' ئے مارکسہ تھیوری تاریخہ اندرا پرولتاریہ ئے انقلابی رول ئے آنہی سجہ ایں تعلیما گوں جذانہ دیوخیں ڈولے آ بستی ایں ۔ ہمے اصول ئے تکمیل پرولتاری ڈکٹیٹرشپ ایں، پرولتاریہ ئے سیاسی حکمرانی ایں۔

پر، پچیکہ کہ بورژوازی خلافا تشدد ئے خصوصی صورت ئے تنظیم ءَ حیثیتا پرولتاری آ ریاست گزریں، تو لازمی اے نتیجہ درکفی: اے قابلِ فہم ایں چہ کہ ہمے ڈولیں تنظیمے بورژوازی پروث ٹاہینغیں مشین ئے ختم کنغا، تباہ کنغا ژہ بغیر ٹاہینتہ کیث؟۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو 1848-51 ئے انقلابہ تجربہ آ خلاصہ کنت سدھائی ہمے نتیجہ ءَ پلوا بارٹت او ہمے نتیجہ ایں کہ ہمشی باروا مارکس ٹوکہ کنت ۔

ناغمان دانشور

شاہ محمد مری

بلوچی میں اچانک برپا ہونے والی فضا کو' ناغمان' کہتے ہیں۔فہمیدہ ریاض نامی خاتون (1946۔2018) ہماری 'ناغمان دانش ور' ہے۔ناغمان اس لیے کہ وہ بڑی سے بڑی اور غیر متعلق ترین لوگوں کی کانفرنس وسیمینار و مجمع میں اچانک وہ موٴقف بتا دے گی جو ہم عامی لوگ اپنے بند حلقے میں بھی نہیں کہہ سکتے۔اللہ جانتا ہے کہ جھوٹ، ہم بھی نہیں بولتے۔مگر طالبان زدہ، اور بلوچستان میں مسخ شدہ لاشوں کی تلخ فضا میں کم از کم الفاظ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ موقف بھی جائے اور حاضرین کو ذرا سا ہضم بھی ہو جائے۔مگر فہمیدہ ایسا نہیں کرتی، وہ ایسا کر نہیں سکتی۔وہ ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولتی ہے اور ہم، بغیر کسی پیشگی خبر اور انتظام کے اس اچانک کی گرج چمک کے دفاع پر خود کو موجود پاتے ہیں، ایڈرینیلین کے زیر اثر دل کی دھڑکنیں بڑھاتے ہوئے، الرٹ رہتے ہوئے ...... ''ناغمان انقلابی، فہمیدہ ریاض''۔

وہ قلم کے مقدس اسلحہ کی مشاق ہوتے ہوئے سیاست سے کبھی لادعویٰ نہیں رہتی۔وہ سیاست کو سماجی زندگی کا لازمی جزو سمجھتی تھی۔وہ سیاسی سماجی اور معاشی معاملات پر رائے دینا اپنا بنیادی حق اور فریضہ گردانتی تھی۔عورتوں کے حقوق کا معاملہ ہو یا بلوچوں کی نجات کا، شیعہ قتل عام کی مخالفت ہو یا طالبان کی دہشت وحشت پر احتجاج، فہمیدہ آپ کو ڈرائنگ روم کے بجائے گلی میں نعرے لگاتی ملے گی۔جی ہاں حتمیٰ اور نعروں کے بارے میں تو وہ خود کہتی ہے: ''جن لوگوں نے کبھی احتجاج کا نعرہ نہ لگایا ہو، وہ کبھی یہ جان نہیں سکتے یہ کیسی جگرخراش صدا ہوتی ہے۔یہ نعرہ بلند کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، محسوس کرنے اور صدائے احتجاج کے لب تک آنے کے دوران آدمی پر کیا گزرتی ہے''۔

فہمیدہ کبھی کبھی تو ایسی جگہ پہ اور ایسے موضوع پہ اایکوازم یا بحث چھیڑ دیتی ہے کہ اگر میری لمبی داڑھی ہوتی تو میں غصے سے اپنی داڑھی کب کا نوچ چکا ہوتا۔وہ ایسے خالی اور مہمل موضوع و مکان میں جدوجہد شروع کرتی ہے کہ جہاں شعلہ تو کیا راکھ بھی موجود نہیں ہوتی۔ہم اُس سے اپنا احتجاج ریکارڈ کر کے اُس وقت تک چپ رہتے ہیں جب تک کہ خود اسے احساس نہیں ہو جاتا۔بس پھر وہ ایک آدھ فون کر ڈالتی ہے یا فیس بک پہ ایک آدھ 'کانفی ڈنس بلڈنگ' فقرہ لکھ دیتی ہے۔یہ اشارہ ہوتا ہے کہ ''مٹی ڈال، اَگے چل''۔

میں اُسے زندگی کی کسی چوکھاٹ، کسی شعبے میں رکھنے کے لیے بہت مصیبت میں پڑا ہوں۔حیران رہا کہ اس ''مٹی کی مورت'' کو برفاب وسنگاب کا شاعر عطا شاد لکھوں، سیاست دان ولکھاری ومقرر و ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کا مجموعہ حبیب جالب لکھوں، جلاوطنی کے سپشلسٹوں کا امام ٹام پین کہوں، یا شاہ عنایت مکتب فکر سے وابستہ کسی مبارز سے مشابہت دے دوں۔فہمیدہ ان سب کی خصوصیات جو رکھتی ہے۔اسی لیے تو تقریب میں کمپیئر نے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا ''یہ ہیں فہمیدہ ریاض۔لیکھک، کوتری، فیمنسٹ اور ایک بدھی جیوی (دانش ور)''۔وہ کمپیئر سیاسی ورکر، جلاوطن، اور رائے کی مالک کہنا بھول گئی تھی۔

آپ حسن، گریس اور نسوانیت دیکھنا چاہیں تو فہمیدہ ریاض کو دیکھیے: اس کے متوازن ومتناسب و موافق وگندمی وحسین چہرے پر بن کا جل اچھی لگتی بڑی زنگی ناوڑسی آنکھیں ہیں۔آپ حسین چال کے لیے عالمی زبانوں میں مستعمل سارے الفاظ ڈھونڈ دیکھیں تو اُس کا مجموعہ آپ کو خرام قدم، اور ایک ہلکے سے جھٹکے میں چلتی ہوئی فہمیدہ میں ملے گا۔آپ کو گفتار میں عورت پن سُننا ہو تو اُسی کو شعر پڑھتے ہوئے، اپنا افسانہ سناتے ہوئے سنیے، جیسے بول نہ رہی ہو غزل پڑھ رہی ہو...... بلا مبالغہ۔مگر وہ اپنی سکون آور، اور شانت کرنے والی آواز سے صرف غزل الغزال ہی نہیں پڑھتی، انقلاب پڑھتی ہے۔اس قدر میٹھی آواز سماج کے دھتکارے ہوؤں کی طرف داری میں بولتی ہے، عورت کے لیے، اقلیتوں کے لیے، مزدوروں کے لیے اور بے تعلیم رہ گئے بچوں کے لیے۔

خالدہ حسین نے ٹھیک کہا تھا کہ فہمیدہ شاید اردو میں وہ پہلی شاعرہ ہے جس نے نظریاتی طور پر انقلاب، اور وہ بھی سرخ انقلاب کے خواب دیکھے ہیں۔

اور اگر آپ کو عقل وخرد، دانش وشعور اور علمیت وتخلیقیت سے سرشار روح سے ملنا ہو تو کراچی کے طارق روڈ کے پاس کرائے کے مکان کے اوپری حصے کے گیٹ پہ سر جھکایئے، فہمیدہ وہیں ملے گی۔عورت وہیں ملے گی، عورت پن وہیں ملے گا۔اور یہ بات تو طے ہے کہ ہمارے عہد میں جن بڑے دانش وروں کے چراغِ شوق کو ہوائے تُند راس ہے تو اُن میں فہمیدہ سرفہرست ہوگی۔

اُس نے زندگی بھر کوشش کی کہ ہر بات کو زمین سے، میٹر سے، اور استدلال سے جوڑے رکھے۔اس نے اپنی کثیر الجہتی اصناف میں سے ہر ایک میں ثابت کیا کہ وہ اپنے سماج وعصر کی اولاد ہے۔نہ خود فرار اختیار کرتی ہے اور نہ اپنے قاری کو بھنگ پی کر سونے دیتی ہے۔اگر ٹی وی چینلوں کی بنائی ہوئی بڑی شخصیتوں سے آپ کی توجہ ذرا ہٹ جائے، یا تمغوں ایوارڈوں کے سرکاری اعزازات پانے کے لیے مر جانے کی حد تک واری واری ہونے والے ''آدھے سر'' ادیبوں سے فراغت مل جائے تو سنیے، میں آپ سے بڑے دعوے سے کہتا ہوں کہ فہمیدہ اس وقت پاکستان

میں ایک بہت بڑی دانش ور ہے۔(''سب سے بڑی دانش ور'' اس لیے نہیں لکھ رہا کہ مجھے دانش کا مقابلہِ حسن رچانے سے گھن آتی ہے)۔

ہم بتا چکے ہیں کہ فہمیدہ جو سوچتی ہے بول دیتی ہے، جو سوچتی ہے لکھ دیتی ہے۔ چونکہ وہ ایک جینوئن دانش ور ہے اس لیے عام روسے ہٹ کر، مروج سے الگ ہو کر 'اُلٹی' باتیں لکھتی ہے۔ فہمیدہ کو موقع ملے تو وہ، وہ باتیں ہمیں سیدھا کر کے بتاتی ہے جو ہمیں الٹی بنا کر بتائی گئی ہیں۔ وہ ہمیں فرق بتلاتی ہے کہ ہمارے سماج میں اصل کیا ہے، نقل کیا ہے۔ اصل، یہ ہے کہ یہاں جبر وظلم ولوٹ و مار وکذب وریا کا دور دورہ ہے اور ضمیر و ایمان و وطن فروشی کی ساری سرحدیں پھلانگی جا چکی ہیں۔ ماسٹر پیسے دے کر ہیڈ ماسٹر بنتے ہیں، بچے نقل کر کے پاس ہو جاتے ہیں۔ کرپٹ، کرپٹوں کو رشوت دے کر نوکریاں لے جاتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں یونیورسٹیوں، کالجوں سے باہر تے کردہ جمِ غفیر روزگار نہ پا کر ثریا تک کج عمارت کو اونچا کرتے جاتے ہیں۔ جنھیں روزگار ملتا ہے، وہ صبح سے شام تک جائز ناجائز پر محنت کر کے اس قدر بھی نہیں کماتے کہ زندگی کی اشد ضروریات پوری کر سکیں۔ بوڑھے زندگی، زندگانی اور زندگانی کی نعمتوں سے ریٹائر ہو کر عبادت گاہوں کے ہول ٹائمر بن جاتے ہیں۔ غربت، معاشی بحران میں ڈھل چکی ہے۔ سماج تقسیم در تقسیم ہو کر ایک ایسے نکتے تک پہنچ چکا ہے، جہاں تقسیم اب چپقلش بن چکی ہے، بلکہ وہاں سے بڑھ کر رنجش اور وہاں سے کھلی جنگ میں ڈھل چکی ہے۔ مذہبی جنگیں، ایک مذہب کے بیچ فرقوں کی جنگیں، زبان کی جنگیں، نسل کی جنگیں............الغرض سوائے طبقاتی جنگ کے ہر طرح کی جنگیں ہو رہی ہیں۔ (اُسی کو انگریزی میں انارکزم کہتے ہیں)۔

اور اِس سب کے خلاف بولنا، لکھنا گویا گناہِ کبیرہ بنا دیا گیا ہے۔ اکثریت لکھنے والے اسی گناہ سے تھر تھر کانپنے کے خوف میں ڈال دیے گئے ہیں۔ صرف فہمیدہ اور اُس کی پارٹی ہے جو لکھتی ہے، لکھتی جاتی ہے، نتائج سے بے پرواہ ہو کر۔ نثر میں، شاعری میں، فیس بک پہ، ایس ایم ایس پہ۔ فہمیدہ ایک مستقل اور لگاتار لکھاری ہے، ''ہول ٹائم'' لکھاری!۔ فہمیدہ سچ کو کبھی سورج میں تلاش کرتی ہے، کبھی تاروں اور چاند میں۔ یہ شریف روح کبھی ایم کیو ایم کے نو جوانوں سے خطاب پہ بے تاب ہوتی ہے، کبھی پیپلز پارٹی کے ہاں اپنا سارا علم رہن رکھنا چاہتی ہے............ بلوچستان تو ویسے ہی اس کی امیدوں، تمناؤں اور خواہشوں چاہتوں کا مرکز ہے۔ وہ تو محفلوں کے لیے بھی مس فٹ ہے۔ نہ صرف اپنی بے چینی میں، بلکہ گفتگو میں بھی کہ اُسے احمقانہ بات لاجواب نہیں، 'ترکی بہ ترکی' بنا دیتی ہے۔ کوئی کہے کہ 'منٹو پاکستان میں آ کر تخلیقی موت کا شکار ہو گیا تھا' تو ہم آپ تو یہ سوچ کر چپ ہو سکتے ہیں کہ یہ بات بڑا ادیب حسن منظر کہہ رہا ہے۔ مگر فہمیدہ ایسی مصلحت کبھی نہیں کرتی۔ فہمیدہ مصلحت نہیں کرتی............ ذات میں بھی، اجتماع میں بھی، مجلس میں بھی اور سماج میں بھی۔ سرکش فہمیدہ!

اسی لیے تو اوپری طبقہ اسے 'دماغ کا کھسکا ہوا' قرار دیتا ہے۔ اور ہم بھی حسبِ توفیق اُسے اتنا ہی بددماغ قرار دیتے ہیں، جتنا کہ وہ ظالم چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم کئی بار خود بھی اپنے احباب کی ایک خاص عادت کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ وہ عادت اچھی نہیں ہے۔ بس اُس کے آگے اُس کا جواز ڈال کر موصوف کو ناراض ہونے نہیں دیتے۔ دراصل ہم خود بھی اُسے اُسی طرح پیش کرنے دیتے ہیں جس طرح کہ مخالفین اسے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک زمانے میں ہم سب دعا کیا کرتے تھے کہ اے خالق، اپنے بندوں پر ظلم تم ہم سے لاکھوں گنا زیادہ ناپسند کرتے ہو، اس لیے اے باری تعالیٰ سرپھروں کی تعداد میں اضافہ فرما۔۔۔ قیامت کی گھڑی دیکھیے کہ یہی سرپھرے اب ہماری صفوں میں سے بہت سوں کو اچھے نہیں لگتے۔ اور ہم بھی اپنے طبقاتی دشمنوں کے پروپیگنڈے میں آ کر اس کی بے باکی کو کوسنے لگ جاتے ہیں۔ گندے تالاب میں لوٹس کا یہ پھول کئی بار اس پر خود بھی خود کو برا بھلا کہہ دیتی ہے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر بولتی ہے:''کیا کروں......ایسی ہی ہوں............''(1)

تنہا کردہ اور مس فٹ فہمیدہ سارا دن تو شاعری نہیں کر سکتی۔ کیا کرے؟۔ ملنے جلنے والے ویسے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں کہ عزرائیل سے ملاقات انہیں فہمیدہ سے ملنے سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ڈاکٹر خدائے داد مرحوم کی طرح ہلا گلا پسند کرتی ہے۔ کوئی ادبی سیمینار ہو، ادبی سفر بالخصوص غیر ملکی، اور ادبی بحثیں ہوں۔ وہ جیسے آدم زاد کے اکھڑ کی کولمبس ہو۔ ڈھونڈھتی رہتی ہیں اس کی آنکھیں، سونگھتی رہتی ہے اس کی ناک کہ کہاں لوگ ہیں؟۔ پہنچ جاتی ہے۔ بات کرتی ہے، اپنا موقف سناتی ہے۔ اور مخالفین کی تعداد بڑھا کر سکون کے دو چار کش لگا کر گھر لوٹ جاتی ہے۔

مجھے اندازہ نہیں کہ وہ پہلے کیسی تھی۔ مگر اب وہ ایک 'بے چین روح' ہے۔ کوئی چیز ذہن میں سما جائے تو وہ آسمان سر پر اٹھائے گی۔ ایسے جیسے گھبراہٹ کا شکار ہو گئی ہو۔ وہ اس وقت تک بے چین رہے گی جب تک اُسے کر نہیں لیتی۔ میں نے دیکھا کہ فہمیدہ سفر کرنے پہ خوش، بلکہ بہت پُر جوش ہوتی ہے، بدحواسی کی حد تک۔ بدحواس کیا وہ تو ہراساں ہو جاتی ہے۔ حیدر آباد تک بھی جانا ہو تو گھر کی الماریوں، سوٹ کیسوں، بیگوں میں سونامی برپا کرتی ہے............ اور اس کے بعد بھی میزبان کے لیے پیک کردہ تحفہ بھول جائے گی، مشاعرہ میں سنانے والا کاغذ گم کر دے گی، یا اپنی عینک کمرے میں ہی چھوڑ جائے گی۔

حوالہ جات

1- ریاض، فہمیدہ۔ شیشۂِ دل۔ کتابی سلسلہ، آج 39، کراچی۔ صفحہ 93

اومیتانی بانک

Princess of Hope

شاہ محمد مری

اب کے سواریاں بدل چکی تھیں۔سعدیہ بلوچ اپنی گاڑی چھوڑ کر ہمارے ساتھ جیئند خان کی گاڑی میں آ گئیں۔سعدیہ پرانی دوست ہیں۔ملتان کے میرے ساتھی میاں اقبال سے کسی سیمینار وغیرہ میں ملی تھیں۔اُسی حوالے سے مجھ سے فون پر باتیں ہوئی ہوں گی۔ہم یقیناً ملے بھی ہوں گے۔مگر جب کوئٹہ دوستوں کے ساتھ ملنے میرے لیب آئیں اور آمنے سامنے بیٹھ گئیں، دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگیں تو مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے دماغ کے کمپیوٹر میں یادداشت والا حصہ کرپٹ سا ہو گیا۔بجائے اس کے کہ موقع کو سنبھالتا، میں بے صبرے نے پوچھا''سعدیہ جی، ہم پہلے مل چکے ہیں ناں؟''۔ اس نے سب کے سامنے کھڑاک سے جواب دیا، '' شاہ محمد، شرم کرو''............۔اور میں شرم اور تکلف میں آج تک نہ پوچھ سکا کہ ہم پہلی بار کب ملے تھے۔ ایک عمر میں جا کر آپ دماغ کو کھرچتے بھی زیادہ نہیں ہیں۔چیزوں کو سنجیدہ لینا ترک کر دیتے ہیں۔بس ملے ہوں گے۔...........ہم ہر اُس ذی روح سے ملے ہوں گے جو ظلمتوں سے نفرت کرتا ہو۔

بعد میں سعدیہ کوئٹہ روزگار کے لیے بھی آئیں اور دو چار ماہ ٹھہریں۔لوگوں سے میل جول رکھا، ہم بس اپنے بے برکت، مگر برحق ادبی سیاسی کاموں میں جتے رہے۔کبھی ملاقات ہوئی، کبھی فون ہوا، یا کسی کے ہاتھ سلام دعا......

اور آج ہم جادو نگری میں پھر آن ملے تھے، بلوچ نگر میں ، افسانوں کی سرزمین میں، آزمانوں کے دیس میں، مائتھالوجی کے گڑھ میں............

مگر اب سعدیہ کی بولتی زبان بھی خود کو لگام دے چکی تھی۔ایسے خوش گوار حیرت کدہ دیکھ چکنے کے بعد جس طرح کی خاموشی بنتی ہے، وہی خاموشی ہماری تھی۔ایک طرح کا تاسف، ایک احساسِ زیاں کہ ہم کیوں پورا بلوچستان دیکھ نہ پائے۔کیوں زیادہ گھومے نہیں۔ایسی بابرکت جگہیں پہلے کیوں نہ دیکھ پائے، مگر اچھا ہوا ہم پہلے یہاں نہ آئے۔ ہمارا سر، جو آج اِس عمر میں بھی مغز سے خالی ہے، تو نوجوانی میں ہم بھلا ہنگول مائتھالوجیکل سائٹ کی قدر و قیمت کیا جان پاتے۔

اچھا کیا خدا نے مجھے بادشاہ اور حاکم نہیں بنایا۔ وگرنہ میں بلوچستان کے بہت سارے پیسے'' ضائع'' کرتا۔میں یقیناً انٹرنیشنل لیول کا ایک بہت بڑا میوزیم بناتا جہاں ہنگول سے متعلق اپنے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی اس ساری افسانوی داستانوں کے مجموعے کو مجسم کرتا۔ملینوں ڈالر اس پہ خرچ کرتا۔میں نصاب میں ساری بلوچ مائتھالوجی شامل کرتا۔بین الاقوامی ریسرچ والوں کو بلواتا۔ٹورازم کو ترقی دیتا ....اور، اور اور .... (ہے کوئی جواں مرد جو مجھ شیخ چلی کی ان خواہشات کی پیاس بجھائے؟!)۔

سعیدہ سگریٹ پیتی ہے۔ اس کے کش لینے کی رفتار اور طوالت سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر گہری سوچ میں ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری طرح غیر رومانی سوچوں میں بالکل محو نہ تھی۔ وہ یقیناً دیویوں اور دیوتاؤں کو وصل کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔حیرانی ہوتی ہے کہ پیاسی ارواح اور رومانس سے سرشار خطے میں آنکھیں تو ہم بقیہ سواریوں نے کھولیں، مگر ہم سے ہزار گنا وکل اور بولڈ و بہادر سعدیہ ہے۔

کار موٹر میں ہم سب زائرین ، خاموشی میں حصہ دار تھے۔ ہم ہنگول میں غرق تھے۔ بہت وقت چپ رہنے کے بعد کہیں جا کر ہم بولنے لگے۔ کار میں جب سعدیہ موجود ہو تو باقی تین سواریاں کیا بول پائیں گی۔وہ کراچی کے صنعتی سماج کی بے تکلفی کی روح تھی اور ہم ابھی غاروں کے سماج کے حجاب کے متعدی مرض میں مبتلا فرسودگی میں گردن گردن ڈوبے ہوئے۔شاعر، دانش ور اور نئے نئے خیالات بھری وہ لڑکی باتیں کر رہی تھی۔ ہم بھیڑ پال لوگ، سعدیہ سے حجاب کے تاثر میں اپنے قبائلی ہم سفروں سے حجاب کے ہاتھوں خاموش تھے۔ہم سب جنگ زدہ بلوچوں کو احساس تھا کہ ایک اور دُرگوش مہیری کو شتر بچوں کے قتلِ عام کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ہم خاران اور نوشکی میں سے کسی کو بھی رامین لاشاری بننے نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ بولتی جاتی ہے، بولتی جاتی ہے۔اور جب موضوع ختم ہوتے ہیں تو ہم مشاعرہ سجا لیتے ہیں۔اس کار موٹر میں دو شاعر ہیں، سعدیہ اور ضیا۔ مجھے تو شاعروں سے یاری کی بدولت کچھ واہ واہ کرنا آتا ہے لیکن عزیزم جیئند خان تو ایسا بھی نہیں کرتا۔ وہ کار موٹر چلاتا جاتا ہے اور جب تک شاعر اُس کا نام لے کر اُسے شعر نہ سنائے، وہ کچھ بولے بغیر بس سنتا جاتا ہے۔چنانچہ میں ہی ''ہاں ہاں، ہوں ہوں، دوبارہ پڑھو''، کہتے رہنے کے تکلف میں ڈال دیا گیا ہوں۔ محبت اور مروت میں بہت فرق ہوتا ہے ناں!۔مشرقی بلوچستان میں واہ واہ کہنا شاعر کی توہین میں شمار ہوتا ہے۔حتیٰ کہ کھانسنے سے بھی شاعر برا مناتا ہے۔یہاں الٹا حساب ہے۔آپ کو شاعر سے بھی زیادہ بولنا پڑتا ہے:''واہ واہ، بہت خوب، کیا کہنے مکرر...........''۔

سعدیہ ہی سنا رہی تھی۔ ہمہ زاویہ، ہمہ پہلو............ایک سٹائل ایک اسلوب، اور ایک سلیقہ والی شاعری جو جدید سے بھی جدید تھی۔ وہ اپنے موبائل سے ہمیں شاعری پڑھ کر سنا رہی تھی، ہم مہذب سے بھی مہذب سامعین بنے اُسے سنے جارہے تھے۔ چھوٹی مگر بھرپور اور پُر معنی نظمیں۔ استعارات، تشبیہات، ادائیگی کا انداز .... انوکھی نرالی نظمیں۔خودکلامی میں جگ ترجمانی۔اشاروں کنایوں سے لے کر بھرپور قیسی عریانیت تک۔ پرت در پرت معانی، شدت بھرا، ایک ایک لفظ جاندار، ایک ایک لفظ پُرسوز و پُر درد۔ مکھن نظمیں جو''واہ واہ'' کی آواز میں پگھل جائیں۔

ضیا شفیع کی شاعری نما چیز بلوچی میں تھی مگر یہاں ایک سواری یعنی سعدیہ بلوچی نہیں جانتی۔ لہٰذا، اُس ایک سواری کی خاطر ہم تین لوگ اپنی مادری قومی زبان نہیں بولے..........بلوچ کی رواداری نے بلوچی کو کتنا نقصان پہنچایا!!۔

ہنگول دریا سے کوسٹل ہائی وے پر آگے بڑھیں تو آپ گنڈ ملیر ساحل پہ آئیں گے۔ اسے ''اگور'' بھی کہتے ہیں۔ وہاں سے درہ بُزی آئے گا۔

ہمیں اندازہ تھا کہ اب ہمیں ایک اور منظر دیکھنے کو ملے گا۔ نعمت کدہ ہے میرا وطن۔ جہاں مٹی جیسی''بے کار'' چیز نے وہ کارآمدی دکھائی کہ صرف اُسے دور سے دیکھنے کے لیے سالانہ اتنے پیسے ملتے تھے جس سے پورے بلوچستان کا بجٹ چلایا جاسکتا ہے۔

اور ایک موڑ مڑتے ہی ہمارے اوسان سلامت نہ رہے۔ .... یہاں سکوت میں ڈوبا بلوچستان ایک اور منظر نامہ دکھانے لگا، بالکل ہی اجنبی، ناآشنا منظر نامہ۔ یہاں ہزاروں سالوں کی بارشوں اور ہوا کی تعمیر کردہ عظیم الجثہ عمارتیں ہیں، مجسمے ہیں، قلعے ہیں۔ بالکل حیرت ہو رہی تھی کہ ہم آئے کہاں پہ ہیں۔ لگتا تھا وطن آج اپنے بیٹوں پہ ہمیشہ سے زیادہ مہربان ہو چلا ہے۔ یہاں آپ کے اندر جمالیات کے مختلف قبائل، جنگ شروع کرتے ہیں۔ یوں تو آنکھ والا قبیلہ جیت جاتا ہے، مگر کان اور ناک کی حسیات کبھی ہار نہیں مانتیں۔ بالآخر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے رہنے پر صلح ہو جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ہم نے چند برس قبل ہالی وڈ کی حسین اور کمال فن رکھنے والی ایکٹریس انجلینا جولی کی تصویر سے اپنے ماہنامہ'' سنگت'' کا ٹائٹل منور کیا تھا۔ انسان دوست، امن و خیر کی سفیر انجلینا جولی۔ بے حد حسین، باصلاحیت اور ہالی وڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ انجلینا جولی۔ اُسے جائز طور طور پر'' دنیا کی حسین ترین عورت'' قرار دیا گیا۔ میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ وہ ''چپٹر'' ہے۔ چپ ہاتھ سے کام کرتی ہے۔ اُس کا دایاں ہاتھ، ایسا جیسا ہمارا بایاں ہاتھ۔

ہماری یہ ممدوحہ انجلینا معروف اداکارہ اور دنیا کی حسین ترین خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی بھلائی اور خیر کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ وہ سیلاب وزلزلہ جیسی آفات میں گھرے ضرورت مندوں پہ خود کو وقف کیے رکھتی ہے۔ وہ سیر الیون اور تنزانیہ گئی، کمبوچیا اور سوڈان کے جنگ زدہ علاقے گئی، ڈارفر، اور خانہ جنگی والے چاڈ پہنچی، جنگ میں جھونکے ہوئے عراق، آتش و لہو میں ڈوبے لیبیا میں جا موجود ہوئی............وہ خود روتے ہوئے اپنی خداترس فطرت میں تیس ممالک میں آفت زدگان کے آنسو پونچھتی رہی۔ وہ بے شمار فلاحی اداروں کو چندہ دیتی ہے۔ وہ ایشیا اور افریقہ سے بے شمار غریب و بے وارث و بیمار بچوں کو لے پالک بنا کر امریکہ لے گئی، اور وہاں انہیں ماں بن کر پال رہی ہے۔

یہ دلچسپ خاتون جب سیلاب متاثرین کی امداد کے لیے پاکستان آئی تھی تو یہاں یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم تھا۔ اُس نے انجلینا کو ظہرانہ دیا۔ انجلینا نے بعد میں کہا کہ کھانے کی میز پر اس قدر شان دار اور وافر کھانا دیکھ کر وہ نہایت آزردہ رہی۔ آٹے کی ایک تھیلی اور پانی کی ایک بوتل کے پیچھے دوڑتے ہوئے سیکڑوں سیلاب متاثرین کے لیے یہی کھانا کافی تھا۔ وزیر اعظم ہاؤس کے شاہانہ اخراجات، نجی چارٹرڈ طیاروں میں سفر اور دیگر ایسی تعیّشات آپ کو بے چین تو کرتی ہی ہیں جب کہ آپ کے سامنے ایک المیہ موجود ہو۔ چنانچہ انجلینا نے اقوام متحدہ میں اپنی رپورٹ میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ اقوام متحدہ پاکستان کو مجبور کرے کہ کسی قسم کی عالمی امداد طلب کرنے سے قبل حکومت اور اس کے اعلیٰ حکام اپنی تعیّشات اور شاہ خرچیوں میں کمی کریں۔............ ہے نا بڑی عورت!!۔

اُسی زمانے میں ہم نے اپنے رسالے میں اِسی ہنگول علاقے کے قدرتی سیکڑوں میٹر بڑے نسوانی مجسمے کو ٹائٹل بنایا تھا۔ ارے ہمارے دائیں جانب افق کے پس منظر میں وہی حیرت کدہ تھی۔ بلوچستان کی براعظمی وسعتوں میں تنہا کھڑی ایک طویل قامت نازک دبلی پتلی، مہین چٹان ہے جو ایک باوقار خاتون سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہم بلوچستان کو بخشی ہوئی فطرت کے سب سے حسین منظر کا نظارہ کر رہے تھے۔

اقوام متحدہ کی''خیر خواہی'' کی سفیر محترمہ انجلینا جولی 2002ء میں اس علاقے سے گزری تھی۔ دراز قد، بلند بخت، پرہ چہرہ، اور حسین بدن والی اس پری کے حسین دماغ نے عورت کے اس بہت بڑے مجسمے کو دیکھا تو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ حیرت سے اس کی موٹی اور متحیر آنکھوں کو کتنی خوب صورتی عطا ہوئی ہوگی۔ استعجاب سے اس نے دراز و بہشتی انگلی اپنے صدف صورت دانتوں میں دبائے بلوچ ارض مقدس کی تقدیس میں اپنی نرم دلی ڈال دی ہوگی............ اس نے اُس قدرتی طور پر بنے ہوئے مجسمے کا نام دُہرایا اور لعل و گوہر جیسے یہ الفاظ بولے: Princess of Good Hope۔ کتنا معتبر و محبوب نام ہے یہ!!۔

مجھے فیس بک پہ امجد نامی ایک صاحب

نے اس کی ایک وضاحت کردی۔ اس کا کہنا ہے کہ "پرنس آف ہوپ"، دراصل بلوچی نام "ایتانی بانک" کا ترجمہ ہے۔ صدیوں سے اس علاقے میں اس مجسمے کو "ایتانی بانک" کہا جاتا ہے، کہ بے اولاد عورتوں کی امیدیں اس مجسمے کے سائے میں برآئیں۔ اُس کے خیال میں انجلینا جولی نے بلوچوں کی "ایتانی بانک" کا ترجمہ کرکے اسے "پرنسس آف ہوپ" کہا۔ یعنی یہ صرف امید کی شہزادی نہیں، یہ خیر کی امید کی شہزادی ہے۔ "اچھی امید کی رانی ...... ھیرہ اومیتھ بانک"۔ الفاظ اتنے بھی بے توقیر نہیں ہوتے کہ اُن کے آگے پیچھے کرنے، یا حذف کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہو۔ بھئی ہنگول کی ہماری یہ شہزادی خیر اور نیکی کی امید کی علامت ہے۔ خیر ہو وطن کی، خیر ہو بلوچستان کی، خیر ہو کُل جہان کی!!

انجلینا جولی ہمارا شکریہ کوئی نہ کوئی تو تمہیں پہنچادے گا ہی۔ نام تو بے نامی، گم نامی کا الٹ ہوتا ہے۔ تم نے ہمیں گم نام رہنے نہ دیا۔ اس عجوبہ قدرت کو اُس وقت نہ صرف انسانی آنکھ نے دیکھا تھا بلکہ ایک اور آلے کی آنکھ نے بھی، جسے انسان، کیمرہ کہتا ہے۔ تب ہمارے کوہستانوں کی یہ رانی، امید کی یہ شہزادی اچانک مشہور ہوئی، پورے لولاک میں۔ ایک نیلا بورڈ لگ گیا۔ جس پر اُس کا نام لکھا تھا: "امید کی رانی"۔

مجھے پھر اچھا لگا۔ ایک اور ماتھا لوجی۔

وہیں میرا دل خود اپنے ساتھ چھیڑ خانی میں لگ گیا: کہ آج زندہ انسانوں میں "اچھی امید کی رانی" کون ہوسکتی ہے؟۔ انجلینا جولی کی عظمت، دانش ورانہ برتری اور اچھے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں نے شش و پنج میں "رتھ فاؤ" کا نام واپس دل کی جیب میں رکھ دیا۔ نہ ہم انسانیت کی اس محسن رتھ فاؤ کو نوبل پرائز دلا سکتے ہیں، نہ اس کے نام کا کوئی مجسمہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ کاش ہم کسی ہسپتال کا نام ہی اُس پر رکھ سکتے............"رتھ فاؤ ہاسپٹل"!!

اور آج، ہم تقدس کی قدموں میں تھے۔

میرا وطن ایسا شان دار کہ اپنے مظاہر کے آگے جھکا جھکا کر غیر کے آگے جھکنے کے سارے امکانات ختم کردیتا ہے، ہاں مگر باضمیروں کو۔ ہم "پرنس آف گڈ ہوپ" کی عظمت میں حیران تھے۔ ہم لولا کی احترام میں ایک دوسرے سے لفظ بھی کہے بغیر، گاڑی سے نیچے اترے۔ سانس تھامے، ساری توجہ اُسی عظیم ساخت کی شہزادی کی طرف۔ اب ہم بہ یک وقت ساٹھ سالہ بچے بھی تھے، اور دھرتی کے کلچر اور سولائزیشن کے ذمے دار ترجمان بھی۔ ہم اسی مٹی کے عاشق بھی تھے، اور محبوب بھی۔ ہم منظر ہم ناظر۔ سامع بھی ناطق بھی، عکس بھی عکاس بھی، حیرت بھی حیران بھی، خمار بھی مخمور بھی۔ ہم اس کے محافظ بھی تھے تباہ کن بھی..........سرزمین تیرے ساتھ کتنا پیچیدہ رشتہ ہے ہمارا۔

اگر یہ منظر امریکہ میں ہوتا تو "سونے کی تلاش" اور "میکاناز گولڈ" نامی بے شمار ناول لکھے جاتے، کئی فلمیں یہاں بنائی جاتیں۔ کئی امین مالوف کتنے جبل الموت تخلیق کرتے۔ بلوچ! تو نے کتنے مواقع ضائع کردیے، تیری کتنی صدیاں خالی گزر گئیں!!

ہم نے توقیر کی، ادب احترام کیا، نشے کی اتاہ حالت میں موجود فطرت کو سلام کیا، ہم جتنا قریب جاسکتے تھے گئے، مگر امید کی دیوی کا دامن پھر بھی سوڈیڑھ سو میٹر دور ہی رہا۔

نہ جانے وہ کب سے اُس بیابان میں بے نام کھڑی تھی۔ ہوا کی تھپیڑیں کھاتی ہوئی، یا پھر اُس کی موسیقی سنتی ہوئی۔ ہوا جو ریت سے آلودہ رہتی ہے۔ جب راہ، شاہراہ نہ تھی تو وہ کس قدر تنہائی محسوس کرتی ہوگی۔ نظر اندازی کا غم بہت اندوہ ناک ہوتا ہے۔ بس ایک عظیم الجثہ Splinx (ابوالہول) ہی اُس کا پڑوسی تھا مگر وہ بھی اس حال میں کہ خود بھی گل اور اس کے پا بھی بہ گل۔ اردگرد تو بس مٹی کے مٹیالے رنگ کی عجیب اور بڑی بڑی بے ترتیب سیکڑوں میٹر طویل ڈھیریاں ہیں۔ سیکڑوں میٹر بلند اشکال۔ یہیں سوگنا بڑا ابوالہول کا مجسمہ فطرت نے بنایا ہوا ہے۔

سیکڑوں میٹر بڑا یہ Sphinx مٹی کے بہت اونچے پلیٹ فارم پہ بنا ہے۔ اتنا دیوہیکل کہ انسان دنگ رہ جائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سر عورت کا اور بدن شیر کا ہو۔ فطرت کی شاہ کار۔ سب سے بڑا انسان کا بنایا ابوالہول تو مصر میں ہے۔ سالانہ ہزاروں لوگ دنیا بھر سے اِسے دیکھنے آتے ہیں اور اس کے بنانے والوں کی تعریف کرتے ہیں۔ حیرانی ہوتی ہے کہ بلوچستان کے ساحلی علاقے میں ایک قدرتی Sphinx موجود ہے جو مصر والے سے عظیم مشابہت رکھتا ہے۔

صدیاں اور ہزاریاں اسی طرح گزر گئیں

تب چین نامی ملک کو بہت بھوک نے ستایا۔ بلوچی زبان میں "آف ڈھاگ" ایک ایسی حالت کو کہتے ہیں جب آپ پانی پیتے جاؤ پیتے جاؤ مگر پیاس مٹتی نہیں۔ چین بھی ایک ایسی حالت سے دوچار ہوگیا ہے۔ بحیثیت ملک اُسے "زرڈھاگ" ہوگیا ہے۔ زر کی پیاس، پیسہ جمع کرنے کی لت۔ پیسہ پیسہ!!!۔ اسے سونے چاندی سے دفنا دو، تب اُس دَم گھٹی کیفیت میں بھی وہ "پیسہ پیسہ" مانگے گا، آکسیجن نہیں۔

وہ زمانہ گیا، یا پھر جانور میں فرق ہے، جب ہم کہا کرتے تھے کہ ڈائن بھی پڑوس کے سات گھر چھوڑ کے تباہی مچاتی ہے۔ لگتا ہے کہ ڈائن اور ڈریگن میں فرق ہے۔ ڈریگن کے لیے اڑوس پڑوس، حلال حرام، ذبیحہ جھٹکا سب بکواس۔ چنانچہ زرو جواہر کے لیے بھوکے چین نے اپنے ہی خواہوں کی مدد سے اپنے ڈریگن کا منہ ہماری طرف کرکے اُس کا کانٹے دار لگام کھول پھینکا۔ اُس اژدہا کے منہ سے نکلے آگ کے شعلے خالص نہ تھے۔ اب کے وہاں سے ابلتا ہوا ایک سیاہ مائع نما زہر آتش فشاں کی طرح بہنے لگا۔ جس کا ایک سرا کاشغر تھا، اور دوسرا گوادر۔ راستے میں جو چیز بھی آئی، سلامت نہ بچی۔ سب ہم وار۔ اِسے وہ

''شاہراہ'' کہتے ہیں: ہائی وے۔ کاشغر گوادر کا ہمارا حصہ ''کوسٹل ہائی وے'' کہلایا۔

اور یہ لاوا بالکل ''اچھی امید کی شہزادی'' کے مجسمے کے قریب سے گزرا۔ اچھا ہوا شاہزادی محض مجسمہ ہے۔ اگر یہ ذرا بھی حرکت کرتی ہوتی تو آج وہ بھی چین کے ڈریگن کے بے انت ومہیب پیٹ کے کسی کونے میں ہوتی۔ سرمایہ داری نظام سے بڑا اژدھا کیا ہوسکتا ہے۔ سامراجیت سے بڑا ڈریگن ابھی تک دنیا نے نہ دیکھا۔

اس شہزادی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس جمے ہوئے لاوا کو کوسٹل ہائی وے کہتے ہیں۔ اور اِس کے اوپر کاروں، ٹرکوں، ویگنوں، اور بسوں کی ''گوش وہوش شکن'' ریل پیل ہے۔

آج ہم اکیسویں صدی کی مغربی دنیا کی شہزادی کے متبرک ذہن و دہن سے مشہور کردہ نام والی قدیم سے بھی قدیم اپنی مشرقی شہزادی کے درشن کررہے تھے۔ اس درشن میں ہم سب اپنے ہوش و ہواس کی گم شدگی سے بھی بے خبر کھڑے تھے۔

بلوچستان آفاقی مصور کا ورکشاپ ہے۔ اس کی ہوا آزر، اس کی مٹی پکاسو، اس کا پانی وان گوغ ،اور اس کا سورج صادقین۔ ایک وسیع کینوس ہے بلوچستان۔ یہ اپنے بچوں سے بھی اسکلپچر بنواتا ہے، اور خود بھی خوب صورت پینٹنگز کرتا ہے...... بس آپ ہنگول ہو آئیں، شرطیہ طور پر آپ بلوچستان کی جمالیاتی حس کی تکریم کرنے لگیں گے۔

ہم حکومت کو ''خدارا، خدارا'' والا غلامی بھرا لفظ نہیں کہیں گے، ہم اُسے اپنی فولادی کُوھلی (مٹکے نما بہت بڑا مٹی کا برتن جس میں اناج ذخیرہ کیا جاتا ہے) سے پیسہ نکالنے کو بھی نہیں کہیں گے۔ ہم اُس کے ورلڈ بینکی سوچ سے عاری پولٹری فارمی چہروں اورنازک دماغوں پہ زور دینے کی بات بھی نہیں کریں گے۔ وہ کچھ نہ کرے۔ بس ''اے سکندرِ اعظم، تم موسمِ سرما کی سردی میں فلاسفر، ڈایوجینز اور دھوپ کے بیچ کھڑا مت ہو''۔ بس اے حکومت! تم انسانوں اور ان مناظر کے بیچ رکاوٹ نہ بنو۔

یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ہنگلاج کو پیسوں، دماغوں، مددگاروں، ماہروں کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہنگلاج اب محض مقامی عجوبہ نہیں رہا۔ ٹورازم کا یہ وسیع وعریض خطہ اس قدر اہم اور زرآور ہے کہ پاکستان نے اِسے صوبائی نہیں، مرکزی کنٹرول میں دے رکھا ہے۔ اس کی دیکھ بحال کے لیے ورلڈ بنک پیسہ دیتا ہے، بے شمار این جی اوز اس پہ پل رہے ہیں۔ اس لیے یہ ایک بین الاقوامی درجے کی جگہ ہے۔............ یہ جگہ اس قدر خوب صورت ہے کہ ملین ڈالروں کی سالانہ آمدن ٹورازم سے ہوسکتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کالج اور یونیورسٹی طلبا کے ہنگول پارک کی بہ نسبت بہت کم خوب صورت اور کم دلچسپ علاقوں کے مطالعاتی دوروں پر حکومت بلوچستان ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے، کوئی اسے یہ سمجھائے کہ ذرا یہ مناظر بھی تو دیکھو، ورطۂ حیرت میں رہتے ہوئے ساری زندگی، زندگی سے محبت کرتے رہوگے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ آپ جب بھی مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس کی سڑاند بھری محفلوں میں بیٹھتے ہیں تو آپ کو اُن کی گفتگو میں دبئ، فرانس اور امریکہ کے حرام کے ذرائع سے کیے گئے متعفن دوروں کی قے آور دوہرائی ملے گی۔ جہازوں، ایرپورٹوں، کافی ہاؤسوں، لفٹوں، ٹراموں، اور ٹائیوں کی خریداری کے قصے ملیں گے۔ جب کہ یہاں اپنے وطن میں محض آواز لگانے کے فاصلے پر بین الاقوامی معیار کے عجوبے موجود ہیں۔ بالکل پڑوس میں۔ جہاں فطرت بھرپور شان اور جوانی اور حسن میں جلوہ افروز ہے۔ سینما ہال میں نہیں، لیپ ٹاپ میں نہیں بلکہ پہاڑوں دریاؤں کے پیچ وخم میں۔ یہاں فیس بک اور ٹوئیٹر آپ کو کچھ نہیں دے سکتے، بلکہ الٹا آپ انہیں مالا مال کرسکتے ہیں۔ نہ یہاں ڈوبتے ٹائی ٹانک پہ آئس برگ کی بولیاں لگتی ہیں نہ ٹی وی ریٹنگ کے لیے کھردری بھدی بھاری آوازوں کو گلیمرائز کیا جاسکتا ہے۔ یہاں انفرادی گلیمر چلتا ہی نہیں۔ ضم ہوجایئے فطرت میں، حصہ بن جایئے بلوچستان کا، حسن وشان وتمکنت و بھاری پن آپ کو گود لے گا۔

ہم گود لیے چار بچے نہ تھے، ہم تو ماں جائے بچے ہیں، سموکی ماں بلوچستان کے۔

ہم نے اُس روز قلم کو نہیں چھوا، ہم کیمرے کی عظیم ترین نعمت سے مزین و مسلح تھے۔ ہم آج سب سے زیادہ مقروض تھے عراق کے سائنس دان ابن الہیثم کے جس نے پہلا کیمرہ ایجاد کیا تھا۔ ہم نے کتنی تصویریں اتروائیں۔ نیلگوں آسمان کی، مٹیالے دیو ہیکل قلعوں مجسموں کی، ساتھ ہی موجود شفاف نیلے سمندر کی۔ عجیب زمانہ آگیا کہ اب اپنے سارے جذبات کا اظہار موبائل فون کے کیمرے سے فوٹو کھچوا کر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہیثم صاحب کے بیٹے کی ایجاد اب بہت بہتر بنائی جاچکی ہے۔ ہم اِس زبردست ایجاد کی نعمت (فوٹوگرافس) کو وہیں سے دنیا کے کسی بھی کونے، جی ہاں کسی بھی کونے کو بھیج سکتے تھے۔ اور وہ بھی پلک جھپکنے میں۔ سرمایہ داری نظام بربادی بھی بڑا کرتا ہے، مگر آسائشیں بھی بڑی دیتا ہے۔

ہم ٹکنالوجی کی نعمت پر شکر و صبر کرنا چاہتے تھے کہ ایک بار پھر نظر پُر شکوہ شہزادی پر پڑی۔ وہ ابھی تک دور دیکھ رہی تھی۔ یعنی ابھی انسانی علم نے مزید بے شمار ایجادات کرنا تھی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ شہزادی اُس وقت بھی نیچے نہیں دیکھے گی۔ ارے بلوچو! چلتے ہی جاؤ، کوئی سٹاپ، فل سٹاپ نہیں۔ اچھی امید کی شہزادی کا حکم ہے کہ سائنس اور علم کے حصول کے لیے نگاہیں دور افق پر ٹکائے چلتے جاؤ۔ پچ، سائنس اور انسانوں کے لیے سہولتوں کی جستجو اور تقسیم میں کوئی آرام، کوئی ستانا نہیں۔

ہم نے شہزادی کی منشا پڑھ لی، اُس کا فرمان پلو میں باندھا، اور نہ رکنے کے لیے چل پڑے۔

سمو کا حسن

شاہ محمد مری

زِعشقِ آں رخِ خوبِ تواے اصولِ مراد
ہرآں کہ توبہ کندتوبہ اش قبول مباد

حُسن کیا ہے؟۔ میں نے اس سوال کا جواب کہاں کہاں نہیں کھوجا؟۔ کتابوں، لغاتوں، انسا ئیکلو پیڈیاؤں اور ویب سائٹوں میں۔ مگر اس کی کوئی تشفی بھری تعریف مجھے کہیں سے نہیں مل سکی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا تصور، اپنا اپنا بیان۔ میں نے جس بھی محبّ وعاشق کو سناپڑھا وہ حسن کی اپنی تعریف ووضاحت لیے نظر آیا۔ ہر qualitative مظہر کی طرح حسن کے بارے میں بھی کوئی مشترک ومتفق فقرہ سامنے نہ آیا۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ حسن کو بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔

حسن کیا ہے، یہ صرف میرا سوال نہیں ہے ۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ نے بھی اکثر یہ سوال خود سے، یا کسی اور سے کیا ہوگا۔ مگر یہ شاید کوئی اکیڈمک معاملہ ہو ہی نہیں!۔ مجھے تو اب یہ یقین بھی ہو چلا ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ عاشق حسن کے پنے تلے اور عام طور پر تسلیم کیے جانے والے مجموعے کو ہی دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہو۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں حسن کے بارے میں تصور کبھی بھی یکساں نہ رہا۔

یہ تصور تہذیبی اقدار کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ شاید ایک آدھ چیزیں جو مشترک رہی ہیں اُن میں جوانی، بے جھریوں والی جلد، متناسب وسڈول جسم شامل ہیں۔ نہیں نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی قانون نہیں ہے۔ ہم نے نیلسن منڈیلا کو بڑھاپے میں ایک معمر خاتون کے حسن سے متاثر دیکھا۔ بے شمار مثالیں دُھرانے سے بچنے کے لیے لفظ ''وغیرہ وغیرہ'' ایجاد کیا گیا۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ '' جسمانی دلکشی''، ہی کو حسن کے مترادف لفظ کے بطور مانا جاتا ہو۔ کہیں جسمانی دلکشی یا اچھی شخصیت کو حسن کہا جاتا ہے جس میں عقلمندی، وقار، کرشمہ، سالمیت، متناسبیت اور لطافت اور خارجی حسن آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عمومی طور پر عام اوسط انسانوں ہی میں سے کوئی حسین یا حسینہ ہوتی ہے۔۔۔۔ ہر انسان دلکش ہوتا ہے۔

ہمیں اِس عنوان سے نمٹنے کے لیے زورزبردستی کر کے محبت اور حسن کو الگ الگ کرنا پڑے گا۔ یہ دونوں مظاہر دنیا میں سب سے پیچیدہ اور مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو یوں ہوتا ہے کہ محبت پہلے ہوجاتی ہے، تشر تحیں بعد کی ہوتی ہیں، حسن اور بے حُسنی کی کھوج بعد کی ہے، اُسے الفاظ وفن کی پوشاک پہنانا بعد کی بات ہے۔

مثلاً سمو مائی کے بارے میں روایت ہے کہ شاید وہ بہت زیادہ گوری نہیں تھی بلکہ سوزارنگ اور سانولی تھی۔ اس کے باوجود سمو کے چہرے اور قد و قامت میں ایک ایسی کشش وجاذبیت تھی کہ اس نے پاکوں کے بھی پاک روح کو اپنی گرفت میں لے لیا اور جسے دیکھتے ہی مست جیسے ''حسن جانچکار'' کی روح و جسم کلٹی ہوگئے۔ یہاں پر ہم محمد سراج مسوری بگٹی کا تحریر کردہ ایک قصہ نقل کرتے ہیں جو اس نے اپنے قبیلے کے بزرگوں سے سنا ہوا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ وڈیرہ علی ہان مری اپنے قبائلیوں کے ایک گھڑ سوار دستے کے ساتھ مری کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ مسوری بگٹیوں کا ایک وڈیرہ ہیبتان خان بگٹی بھی اُس کے ساتھ تھا۔ وہ ایک بڑے تالاب کے قریب سے گزرے۔ تو انھوں نے مریوں کی کئی خواتین کو پانی بھرنے کے لیے تالاب کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ علی ہان مری نے ہیبتان بگٹی سے کہا کہ مقدم! ان خواتین میں مست کی محبوبہ سمو بھی موجود ہے۔ ہیبتان نے سمو کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ علی ہان نے کہا ہاں میں اس کو بلاتا ہوں، وہ آئے گی۔ چنانچہ علی ہان نے ذرا آگے جا کر خواتین سے کہا، ''بہنو! مائی سمو کو کہو کہ وہ ذرا آئے، بزرگ شخص ہیبتان مسوری اس کو دیکھنا چاہتا ہے''۔ چنانچہ سمو عورتوں کے گروہ سے نکل کر علی ہان اور ہیبتان کی جانب آگئی۔ اس نے ادا (بھائی) کہہ کر مقدمین کو خوش آمدید کہا اور دُراہی (مصافحہ) کر لیا۔ پھر ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیر خیریت پوچھ لی۔ ہیبتان نے جواباً سمو کی خیر خیریت پوچھ لی۔ اس کے بعد ہیبتان نے کہا، ''گُہار (بہن) میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے اور تکلیف دی کہ مست آپ کے حسن کی بہت تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ مجھے وڈیرہ نے بتایا کہ آپ ان خواتین میں موجود ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ کو ایک نظر دیکھ لوں''۔ سمو نے کہا، ''ادا! مست زوراخے مناں اِکھریں صورت تہ نیستیں، مں ہمشاں کہ تئ چمانی دیمایاں۔ (بھائی! مست زورآور ہے، میں اس قدر خوبصورت تو نہیں، میں تو یہی ہوں جو آپ کے سامنے ہوں)۔

مجھے لگتا ہے کہ سمو کا یہی فقرہ حُسن کی یک فقرہ ای ڈیفی نیشن ہے: ''مست زوراخے''۔ عاشق کو دلیل کہاں قائل کرسکتا ہے۔ کبھی کبھی اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آبجیکٹ ومنظر یعنی یار کا چہرہ، اوزار یعنی عاشق کے دیکھنے والے کی آنکھ اور سبجیکٹ یعنی دیکھنے والے کا دماغ، اِن تینوں میں فیصلہ کن کون سا ہے؟۔ شاید تینوں۔

'' بقول ہیبتان مسوری سمو ایک درمیانے قد کی دلکش سوزارنگ خاتون تھی''۔

مجھے ایک اور سوال نے بھی گھیر رکھا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ مست کی سمو، اور مجنوں کی لیلیٰ گوری نہ

تھیں۔وہ سوزارنگ کیوں تھیں؟۔ ہماری شاعری میں بھی محبوبائیں سوزارنگ ہوتی ہیں۔سوزو، سوزاں پری ۔۔۔کیا ہم سوزارنگ پسند کرتے ہیں؟۔

یہ تو شاید ہم نہ بتاسکیں کہ حسن کیا ہے، ہم تو بس یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا کیا کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا مظہر ہے جو فوراً ہی جذبے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔حسن کی نشانی یہ ہے کہ اکثر یہ تلاش کرنے سے نہیں، بلکہ بس اچانک مل جاتا ہے ۔اور دیر سویر دھوبی کے کپڑے کے تھڑے پہ دھوئے جانے کی طرح یہ اپنے متاثرہ شخص کو پٹختا چلا جاتا ہے ۔ خوب grind کرکے، ڈی کلاس کرکے، پھر اُس کا راہنما بن جاتا ہے ۔ایک ایسا نور جو ہمیں ظلمتوں میں بھٹکنے نہیں دیتا۔ اور ظلمتیں تو ہمیشہ باطل کی ملکیت ہوتی ہیں ۔ایک نہ چُبھنے والی روشنی ۔ ملائم، اور سکون بخش روشنی جس میں کیف ہے خمار ہے۔مُسکان میں سلگتا ہوا دل ہے، ایک گم گشتہ انداز میں تڑپتی ہوئی روح ہے ۔۔۔حسن نظر آتا ہے آنکھوں کے بغیر بھی، سنائی دیتا ہے کانوں کے بغیر بھی۔۔۔ یہ ابدی کھلا گلستان ہے۔ گاتے کِلکِلیں کرتے دائمی پرواز کرتے ''ہیروں'' کا ڈار ہے ۔حسن کی اپنی ایک نورانیت ہے۔حسینہ کے چہرے پہ نقاب ہو نہ ہو، حسن کے چہرے پہ کوئی نقاب ہو نہ ہو مگر عاشق کو ہمہ وقت اس پہ حجاب نقاب دبیز ہی لگتا ہے ۔حسن ہدایت ہے، ہدایت نامہ ہے، ہدایت کار ہے۔حسن کو بقا ہے دوام ہے، اسے کبھی موت نہیں آتی۔حسن ابدی، ابد مان اور ابدیت۔

حسن کا بیانیہ بہت سی جہتیں، بہت سی صورتیں رکھتا آیا ہے۔اب تو خیر ہم کپٹلزم میں جی رہے ہیں۔ جہاں بورژوازی کے مسلط کلچر کے تحت لگتا ہے سب چیزیں بدل کر رہ گئی ہیں۔ کپٹلزم میں حسن اب ایک کوالی ٹیٹو مظہر نہیں رہا بلکہ اس کو کوانٹی ٹیٹو بنایا جارہا ہے۔ پتہ نہیں حسن ناپنے کے لیے کیا کیا اوزان و پیائش وضع کیے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نام نہاد ماہرین، ٹخنوں کو تولتے ہیں، پنڈلیوں کی نظریاتی سرحدیں ناپتے ہیں، رانوں کا الٹرا ساؤنڈ کرتے ہیں، کولہوں کے بھنور دیکھتے ہیں، بانہوں کا درجہ حرارت ناپتے ہیں، ہونٹوں کی پٹوار گری کرتے ہیں، رخساروں کو اعشاری نظام میں دیکھتے ہیں۔۔۔اور اس طرح کسی کو ملکہِ حسن قرار دیتے ہیں ۔ارے گز تو کپڑا ناپنے کے لیے ہوتا ہے، لیٹر پیٹرول ناپنے کے لیے ۔ مگر، حسن کو ناپنا؟۔۔۔لعنت ہے ناپ تول پہ۔لعنت ہے سرمایہ داری نظام پہ۔لعنت ہے اِن پہ۔حسن کی بے حرمتی ہے یہ۔حسن ہی اُن سے نمٹ لے گا۔

حسن تو ایک ضرورت ہے، ایک مظہر ہے ، ایک وصف ہے، ایک کیف ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ حسن وہی جسے محبوب چن لے ۔اب کیا کیا جائے ۔ آپ کتابوں پہ کتابیں لکھ ماریے مگر ایک شخص یہ کہہ کر گویا آپ کی ساری علیمت کا نچوڑ نکال دے گا:

سمّلئے دستانی نغن وہشاں
تو نزیں کہ بنّیں تافغاں پشّاں

سمو کے ہاتھوں کی پکی روٹیاں لذیذ ہوتی ہیں
خواہ پتھر کے توے پہ پکی
ہوں

دوسرے لفظوں میں مست ایک اور بات کر رہا ہے، کہ آپ ساری دنیا کے ڈگری یافتہ حسن دانوں کو ان کی عریاں مشینوں میٹروں کے ساتھ بٹھا لیں مہینوں ان کے بے دماغ سر جوڑ لیں، ہزار بے معنی تشریحات اور لاکھ بے بنیاد وضاحتیں سن لیں، مقالے پڑھ لیں مگر حسن سمو ہے، بس!۔حسن حسینہ سے ہوتے ہوئے عاشق کے دل میں پیوست ہوجاتا ہے۔عاشق کی حسینہ کچھ بھی کہے اچھا لگتا ہے، وہ کچھ بھی پہن لے اُس پر جچتا ہے وگرنہ بلوچی فوک کے مطابق ململ اور جگمگ کرتا لباس تو ہر ایرے غیرے نے پہن رکھا ہوتا ہے۔

تو پھر، حسن کا سب سے بڑا ''جانچن ہار'' کون ہے ۔جنس زدہ ماہر؟ اُس کے بے مروت پلاسٹک کے آلات ؟، زرخرید میڈیا ؟، یا، بے شعور دانشور؟.........نہیں نہیں۔حسن کا بیرومیٹر محض مخصوص آنکھ ہوتی ہے ۔ وہ آنکھ جو بہہ بہہ کر حسن کے حسین ہونے کی گواہی دے۔وہ آنکھ جو راتوں کو دیر تک لگنے سے انکاری ہو۔اُسی کی بات معتبر، اُسی کا معیار بلند اور اُسی کا فیصلہ حتمی۔یاد ہے ساری دنیا نے کہا تھا سمو حسین نہیں ہے، ساری دنیا نے کہا تھا لیلیٰ حسین نہیں ہے۔ ....مگر ہم آج تک سمو اور لیلی کے گیت گاتے ہیں ۔دنیا نے اس سلسلے میں سارے عرضی نویسوں فلاسفروں، ایٹم فروش سائنس دانوں اور میرینز کمانڈروں کی صدارت میں مشاعرہ پڑھنے والے شاعروں کو مسترد کردیا، اور صرف مست اور مجنوں کا فیصلہ مانا ہے۔

مگر ہاں، یہ ضروری ہے کہ جانچنے والا عاشق ہو، سوداگر نہ ہو۔کیونکہ اگر جانچنے والا سڑے ہوئے بدبو بھرے دل والا ہو، اُس کی اپنی روح اور روبہ گلا ہوا ہو تو پھر حسن تو ٹکے کی چیز بھی نہ ہوگی۔

حسن محبت ، حسن کشش، حسن جاذبیت، حسن وابستگی، حسن نزاکت، حسن تکریم، حسن بقائے باہم کا مبلغ.............

اور پھر مست توکلی سے بڑا حسن شناس بھلا اور کون ہوسکتا ہے کہ حُسن ہی تو مست جیسے حکیموں، داناؤں اور دانشوروں کا مندر ہے۔مست ہی حسن کی الوہیت پہ یقین کرسکتا ہے۔آیئے، اس کی شاعری میں سے (سموکے) حسن کی توصیف میں کہے گئے الفاظ چُن لیں:

''سمو قوسِ قزح ہے جو پانی بھرے بادلوں میں آن کھڑی ہوتی ہے ۔بارش کے بعد کے منظر کی ہم شکل ہے اور بادِ سحر کی طرح خوش کن مہ لقا ہے ، سرحدوں کی مالکن، گھنی سنگین و ناگن جیسی زلفوں کی مالکن ہے۔خوش قد ہے، آہو گردن ہے ۔۔۔۔ چہرہ روشن چراغوں جیسا، زلفیں بل کھاتے سانپوں کی طرح جنگلی آہوؤں کی طرح نہ سدھائی ہوئی۔۔۔۔تیز جیسے

تیغِ برّاں۔۔۔ اس کے کاغذ جیسے باریک لب لُو کی طرح جلا ڈالتے ہیں۔۔۔ اس کے سیپی جیسے دانت شورہ کی طرح پکا دیتے ہیں۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں پہاڑوں پہ ٹھوکریں کھلواتی ہیں ۔۔۔۔ چودھویں کا چاند ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر سے فروزاں ہوکر، اور آسمان پہ بلند ہوکر ہر سو چاندنی پھیلاتا ہے ۔۔۔ بارشوں کے بعد منظر اتنا حسین ہو جاتا ہے کہ اس سے سمو کی صورت یاد آجاتی ہے ۔۔۔ خوبصورت بدن پہ ریشمی لباس ہے۔۔۔ اس کی صورت دور دراز سے آنے والے بادلوں بارشوں کی سی ہے۔۔۔ گہری زلفوں کے جاد (پراندے) ہیں پتلی کمر تک، سمو صحت بخش پہاڑی درختوں کا میوہ ہے۔۔۔

''سمو شراب بھرا جام ہے، سمو گرم ترین کوہِ زین نامی پہاڑ کی چوٹی پر اگے ہوئے سایہ دار پیپل کے درختوں میں سے ایک ہے ۔۔۔ سمو انار کا احمریں پھول ہے، سمو پہاڑی ہرن ہے، سمو اندھیروں میں چراغ ہے، گھر گھر کر آنے والے بادلوں کی ایک بدلی ہے ۔۔۔ اس کی آنکھیں لال، جیسے مہندی دی ہوئی ہوں اور جیسے رات کو ہلکے بادلوں میں بجلی چمکتی ہو ۔۔۔ پرخمار آنکھوں سے ایسی سرخی چھلکتی ہے کہ عاشق بھسم ہوجاتے ہیں۔۔۔۔ تمہاری چال میٹھی، ہنسی نقرئی، تمہاری آواز جیسے صبح سویرے بجتا ستار ۔۔۔ سینے پہ تاویت جیسے بادل میں بجلیاں تالیاں بجاتی ہوں۔۔۔ کونج جیسی گردن پہ خمیدہ طوق، میری دوست کے سینے کی اترائیوں پہ تین تہوں والے تاویت لٹکتے ہیں۔۔۔، اس کی ہنسی کتنی شیریں ہے، آنکھ ایسی دلکش جیسے ہزار نوع کے سرمے لگا رکھے ہوں ۔۔۔ وہ نکلتی ہے اپنی شادی والے خیمے سے اور لال تاخ کی خوشبوئیں اس کا پیچھا کرتی آتی ہیں ۔۔۔ وہ اتنی خوبصورت ہے جیسے لیموں کے میوے ہوں۔۔۔ اس کے دانت اس قدر خوبصورت ہیں گویا قطار میں برسنے والے سفید بادل ہوں ۔۔۔ میٹھے ہیں لب جیسے بھیڑ کا لذیز دودھ ۔۔۔، سینے کے دونوں پھول کاٹ ڈالتے ہیں ۔۔۔ سرخ خماری آنکھوں والی سمو حسین ترین سہیلیوں میں بھی لعل ہے ۔۔۔، سونے جیسے چہرے پہ کیا جچی ہوئی آنکھیں ہیں!!۔۔۔، ذرا سمو کی سی صورت کی کوئی دوسری عورت تو تلاش کر کے دکھاؤ، ۔۔۔۔ وہ پیسوں میں چاندی ہے، اشرفیوں میں سونا ہے۔۔۔ اس کی چال کبوتروں کی ہے، اس کی زلفوں سے لونگ اور عطر کی خوشبو آتی ہے، وہ بال پیچھے باندھتی ہے۔۔۔ سمو، جیسے بارشوں کے موسم کی ہلکی ہوا میں پتے لرزتے ہوں۔ اس کی شاخیں (زلفیں) زامر کے درخت کی لمبی لمبی شاخوں کی طرح زمین کی طرف لہراتی ہیں ۔۔۔، میری محبوبہ تازہ ہے، تازہ ترینوں میں سے تازہ ترین سے بھی زیادہ تازہ۔۔۔

''وہ میدانی ہرن ہے۔۔۔ میں نے اسے علاقوں میں جھومتے دیکھا ہے ۔۔۔ تمہارے گھنے پراندے کے اوپر لگے ہوئے (زیور) سونے کے ہیں ۔۔۔ سمو تو ایک لعل ہے، اس کی ساخت میں کہیں کوئی عیب کوئی بے ترتیبی نہیں، سارا ٹیڑھا پن جیسے ماہر تیشہ گر نے نکال دیا ہو، جیسے سارے بل (ماہر صناع نے) نکال دیے ہوں ۔۔۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ آنکھوں کے کنارے سرخ ہیں، ناک ستواں ہے، ابرو باہم ملے ہوئے ہیں۔۔۔ قربان جاؤں تمہاری نرم رفتاری پہ، شیریں قہقہوں پہ، تمہاری خوشبوؤں پہ، ۔۔۔ دونوں ہاتھوں کی مُندریاں آگ کی طرح فروزاں رہتی ہیں۔۔۔ کشیدہ کی ہوئی قمیص کو جڑواں پستانوں نے اوپر تھام رکھا ہے ۔۔۔ وہ بلند و کٹھن چٹانوں پہ اُگا لونگ کا نازک پودا ہے۔ ایسی خوشبوئیں جیسے خُمب کا پودا خوشبو دیتا ہو۔ انہی خوشبوؤں نے تو میرے سینے کی قاتل چبھن کو ٹھنڈا کردیا اور میری آنکھوں کی تہوں سے پردے ہٹا دیے ۔۔۔ وہ تو شہنشاہی باغوں میں لیموں کا درخت ہے جس کی شاخیں اچھی ہیں اور رنگ و صورت مصری کی طرح میٹھی ہے۔۔۔ سینے کے پھول (پستان) روح چھیننے والے ہیں۔۔۔ اس کی پرخمار آنکھوں سے بجلیاں کوندتی ہیں۔۔۔ وہ بہشت کے لیموؤں کی طرح لذیذ ہے، وہ مکران کے آم اور انگوروں کی سی شیریں ہے ۔۔۔ وہ پری ہے یا عرشی فرشتہ ۔۔۔ تمہاری چال سلامت رہے، حدیث جیسی گفتار سلامت رہے، قہقہے سلامت رہیں۔ میں تمہاری چال کی خاطر کوہلو اور کاہان بخش دوں گا۔ میں تمہاری چال کی خاطر اپنی آنکھیں قربان کردوں گا۔۔۔

''وہ جنگلی ہرن کی طرح دور بھاگتی ہے، نوخیز مہریوں کی طرح تیز ہے، مدھر دھن والی شہنائی جیسی آواز، چندھیا دینے والی مہندی لگاتی ہے۔۔۔ قریب المرگ مریضوں کو تندرست کرتی ہے، اڑتے ہوئے پرندوں کو ہاتھ سے پکڑتی ہے، پاگلوں مجنونوں کو صحت مند بناتی ہے، اور ہوشمند کو پاگل بناتی ہے۔ وحشی ہرنوں کو نرم رفتار بنا دیتی ہے۔۔۔ ''۔

***

مست عظیم ہے کہ اُسے اس بات کا ادراک ہے کہ حسن تعریف کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے۔ بلا شبہ حسن مقدار نہیں، معیار ہوتا ہے۔ حسن وہ دوشیزہ دیوی ہے جس کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں۔

عشاق اپنی دوست کے حسن کی توصیف اپنے اپنے انداز میں کرتے چلے آئے ہیں۔ ان میں کئی لوگ یہ کام بہت ہی فطری انداز میں بلا تصنع اور بے ساختہ کرتے ہیں۔ مست انہی عشاق و شعرا میں سے ایک ہے۔ اُس کے ہاں بلا کی بے ساختگی ہے۔ حسن کا اُس کا بیانیہ بہت ہی ڈائریکٹ، واضح اور حتمی ہوتا ہے۔ نقطۂ نظر بہت سادہ۔ اُس کے تصورات فطری طور پر اس کے اردگرد سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مست تو خانہ بدوش زمانے کا عاشق و شاعر ہے۔ فطرت اور فطری حسن، اور سادگی ہی اس کی روح کے سکون کو قتل کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

مست اپنے محبوب کے حسن کو مکمل پاتا ہے ۔۔۔ حسن تو مکمل ہی ہوتا ہے۔

اور محبوب کے حسن کو صرف محبّ ہی تلاش

کرسکتا ہے۔صرف وہی اُس کی داد دے سکتا ہے، وہی اُس کی بلائیں لے سکتا ہے اور وہی اُس پہ جان دے سکتا ہے۔دوسری ساری خلقت عامی بن جاتی ہے، اُمی بن جاتی ہے۔دوسروں کی آنکھیں وہ Waves پکڑ ہی نہیں سکتیں، رسیونگ سٹیشن جام ہو جاتا ہے سب کا۔ ایک ہی وجود، اور اس کا ایک ہی ثنا خواں۔دوسروں کو بے شک وہ کالی، بھینگی نظر آئے، توتلی، قبیح نظر آئے۔ مگر محبت کرنے والا اُسے کامل ہی دیکھتا ہے۔مست کی سمو تو ویسے ہی تقدیس بھری تھی۔وہ تو خلیاتی سطح تک کامل تھی۔۔۔حتمی مکمل، مکمل مکمل۔کہیں کوئی ٹیڑھ، کوئی جھول، کوئی نقص نہ تھا۔

دوازدھیں بنداں نیستنی عیوماں انگھاں
(اس کے کسی بھی عضو میں کوئی عیب نہیں)

مست اپنی سمو کو لاثانی قرار دیتا ہے۔سمو کی کوئی اور مثال نہیں، کوئی اور نظیر نہیں۔

سملئے لوڈاں تی جنے کاھانا نہ خاں
(سمو کی مدھر چال والی کوئی دوسری عورت کاہان میں کبھی نہ ہوگی)

اور

پولغا سموئے بدل پیداشہ نواں
(ڈھونڈو بھی تو سمو کا ثانی نہیں ملے گا)

مست حُسن کے لیے بلوچی کے جمیل ترین الفاظ استعمال کرتا ہے۔اس کے امثال، ضرب الامثال ، استعارے، تشبیہات، سب بلوچی زبان اور بلوچی سماج کے وسیع خزینے کے موتی ہیں۔۔۔حسن اور بلوچی ہم معنی، حُسن اور بلوچی ہم جولی اور، حُسن اور بلوچی ہم سفر۔ بلوچی سادہ، بلوچی فطرت کے قریب، بلوچی سچی، بلوچی بھاری، بلوچی معزز، بلوچی شیریں، بلوچی میوزک، بلوچی شہد وشیر، بلوچی عمیق۔۔۔بلوچی بہت بڑی زبان ہے۔اس بڑی زبان کے لیے شایانِ شان تھا مست، اور مست کے شایان شان تھی دوستِ مست۔اور اِن سب کا شایانِ شان تھا حسنِ دوستِ مست!!

اور کاغذ کی مدہوش خوشبو میں گھر کر لیا

نسیم سید

وقت کا
اک
چھوٹا سا ٹکڑا
گرا ٹوٹ کے
اور سانسوں کی الجھی ہوئی جھاڑیوں میں رو پہلا
جھما کہ ہوا
دودھیا روشنی
چمپئی ساعتیں
سر پھری دھڑکنیں
مطمئن الجھنیں
زندگی
وقت کے سارے حیلوں
بہانوں سے
اور ایک لمحہ میں
آنکھیں بدلنے کے
ہر گر سے
واقف تھی
سو
سخت حیران تھی
یہ بھی اس کی
کوئی چال ہے
ریشمی سا کوئی جال ہے
تذبذب پہ میرے وہ لمحہ
عجب نقرئی سی
ہنسی ہنس دیا
کندھے اچکا
اور سوچ کی جھاڑیوں
میں جڑوں تک اجالے کا بستر کیا۔
"بنت_ناعاقبت
عشق وجدان ہوں
لمحہ کن ہوں میں"
اس طرح
سانس کی
سوکھی، الجھی ہوئی
جھاڑیوں میں تری
یوں پڑے رہنا منصب نہیں ہے مرا
ہوش کر، سوچ لے
ورنہ میں تو چلا۔"
میں نے سوچا نہیں
خود سے پوچھا نہیں
پھر یہ کیسے ہوا؟
آگ کی پہلی چنگاری جیسی ہتھیلی پہ روشن ہوء
وہ جو اک چیز ہے
معجزہ نام کی
اس کا وجدان
بھر بھر کٹوروں پیا
کوئی تاکید تھی
نا کوئی وسوسہ
صرف اتنا کیا
ہم نے اک دوسرے کی
بشارت پہ تکیہ کیا
عودسی روشنائی کا
لفظوں کو
نظموں کو ریشم دیا
اور کاغذ کی
مدہوش خوشبو میں
گھر کر لیا

امین کھوسہ کے نام یوسف مگسی کا خط

23.3.1934

خوابوں کی دنیا میں رہنے والے بھائی!

بی۔اے ہونا مبارک ہو،تمہارا طویل خط ملا ، پڑھا ۔ سیف کی باتیں تمہاری زبانی کیسی میٹھی تھیں۔تمہارے جذبات ، والدہ کے پیغام،نفس کاغذ سے امینیت کی بو۔........... آہ۔................. ایک زہر خندہ،ایک والہانہ کھلبلی اور پھر وہی معمولانہ خاموشی اور میں۔

امین! مانا کہ میں اپنی آگ سے آپ ہی جل چکا ہوں ۔ یہ مافوق العادت قوتوں سے سروکار رکھنے اورعنانِ خیال کوانسانی وسعت سے پرے ڈھیلا چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے ۔جس طرح کثیف ہوا آمد ورفتِ نفس کومشکل بنا دیتی ہے بعینہ اسی طرح میرا معاملہ ہے ۔مگرتم مجھے جانتے ہو، میں مایوس نہیں ہوا، مایوس ہوناختم ہوجاتا ہے۔آرزوئیں آباد رہیں،خواہ کبھی بھی زلفِ یارتک رسائی نہ ہو،مگر دل ودماغ کا معاملہ اُس کے ساتھ ٹوٹنے نہ پائے۔

’’علی گڑھ ہوتے ہوئے کوئٹہ جاؤں؟‘‘

۔۔۔خوب کہی! کیوں علی گڑھ یہاں نہیں آتا؟۔بی۔ اے تو ہو چکے،اب علی گڑھ میں اور کیا کرنا ہے ۔ذرا نکلو ، دنیا کو دیکھو۔ اے اسیرِ قفس !اے پیکرِ ذہن ودماغ ، غلامی کے ماحول میں رہنے والے ! تمہاری ذاتی ذہانت خواہ تمہیں اس ماحول سے باہر جانے کی اجازت بھی دے،مگر پھر بھی ماحول اپنا رنگ جمائے بغیرنہیں رہ سکتا۔آؤ، دیکھو،قومیں کیا سوچ رہی ہیں، آج کل کے موضوع کیا ہیں؟

ہندوستان میں مذہب ، اچھوت ، ہندو ، مسلم، سکھ عیسائی،شعیہ سنی وغیرہ ،کبھی اس کے علاوہ بھی کوئی بات سننے پائی ؟

اسیرِ رنگ وبو! غلامِ این وآں ! تمہاری بربادی کا باعث انگریز نہیں بلکہ تمہارے دراز ریش مذہب فروش باشندے ہیں۔کم بختوں نے مذہب جیسی بلند تخلیق کو دنیا کا بدترین کھلونا بنا کرانسانی آبادی کے ایک عظیم حصے کو برباد کرڈالا،خدااان سے سمجھے۔

حیران ہوتا ہوں جب بڑے بڑے دماغوں کوان امتیازوں کا اسیر دیکھتا ہوں اورامین ان کی تعریف کرتا ہے۔چلوجی شیخ عبدالمجید صاحب،آپ کا مخدوم،اسلام کا خدمت گار۔سچ ہے غلام کی نظر،غلام کی بصارت بھی ایسی بنائی گئی ہے ۔خیر! تم جانو اور تمہاری سیاسیات ، ہم تو ابھی زخمی سپاہی ہیں جو Holiday منا رہے ہیں۔دیکھا جائے،پھر میدان کی شکل نصیب میں ہے یا کچھ اور۔

آؤں گا،گھبراؤ نہیں،خیر سے انتظار کرو۔

آپ کا آخری استفسار،شعریت کا آلہ۔۔۔بھائی!یورپ ہمہ تن شاعر اور دنیائے شعریت اور پھر یہ استفسار ۔۔۔مگرامین ! یورپ کے متعلق آپ کے علمایانِ دین کی تمام رائیں غلط،یکسرغلط بخدا کہ غلط۔یورپ بہت آزاد ہے ۔آپ سے بازار میں ، ریسٹورانوں میں، پارٹیوں میں آزادانہ عورتیں ملیں گی، باتیں کریں گی، کھیلیں گی، سنائیں گی اور رشتہ دار کوئی بھی دخل نہیں دیں گے۔مگراخلاقی لحاظ سے وہ برائی جوآپ کے دراز ریش حضرات اس سے منسوب کرتے ہیں ، ایک فیصدی پائی جائیں گی۔ یہاں کی عورت اپنی عصمت کی حفاظت آپ کے رسم ورواج کے مطابق پردے اور تلوار وبندوق کے ڈر کے ذریعے نہیں کرتی،ان کا معیار کچھ اور ہے۔کاش کہ اس میں تفصیلات لکھ سکتا۔ یہاں کی کنواری عورتیں اور وہ عورتیں، جو شادی شدہ ہیں،عصمت کے معاملے میں انتہائی معیار پر پہنچی ہوئی ہیں۔باقی رہا آپ کی ہندوستانی معاشرت کے مطابق وہ طبقہ جو ساز وسرود کے ساتھ علانیہ بازاروں میں عصمت فروشی کرتا ہے ، یہاں وہ ہے مگرمختلف رنگ میں۔میرا مطلب یہ ہے کہ اُس رنگ میں جس سے دوسروں کو برائی کی ترغیب نہ مل سکے۔مگر بہت کم ، بہت کم۔

آپ حیران ہوں گے ، جب ایک کنواری یورپین لڑکی ایک دو بجے تک گھر سے باہر آپ کے ساتھ کسی پارک میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے اور مختلف موضوعات پر بحث ہورہی ہے۔۔۔ممکن ہے شعروشاعری یا محبت وغیرہ پر ہی بحث ہو،ممکن ہے وہ آپ کے ساتھ اقرارِمحبت بھی کرے۔مگرکیا مجال ہے کہ ایسی رومانٹک فضا میں، یورپ کی زندہ کن فضا میں، تنہائی ، نیم شب کا وقت، ایسے وقت میں بھی اس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی عصمت فروشی کی طرف منتقل ہو۔اگر بیوقوفی سے آپ کا خیال اس طرف منتقل ہوجائے تواس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنا وقار، اپنی اخلاقی حالت کواس کی نظروں میں مجروح کردیا۔ یہ ہے یہاں کی اخلاقی حالت ۔آپ کے مولویوں کی بنائی ہوئی عورت پردے میں رہے گی ، مرد کی شکل نہ دیکھ کرمحض نظر کی جبریت پر عامل ہوگی، وہ مذہبی ، دیندار، نمازن کہلائے گی، مگر معاف فرمائیے گا کہ پچاس فیصدی، جب ورثا کی غیر حاضری میں آنکھ کا کوئی اشارہ ملے گا،توہمہ تن خون ہوکر بہہ جائے گی:

نکورو تابِ مستوری ندارد
چودر بندی سرازروزن برآرد

یہ ہے نتیجہ پابندیوں کا۔ جذبات و

خیالات، جو رسم ورواج کی پابندی سے راہ نہیں پاتے، وہ عورت کو باغی، عیاشی کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ وہ Day Dreaming میں اوقات بسر کرتی ہے اور یہ دماغی عیاشی اس کے کیرکٹر کو بہت نازک اور ناپائیدار بنا دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذرا سے اشارے کی یا ذرا سی ترغیب کی دیر ہوتی ہے اور ورثا کی غیر حاضری کا موقع، بس پھر آپ جانتے ہیں۔

یہاں کی عورتیں ہر قسم کی آزادی سے بہرہ ور ہیں۔ مردوں سے کھیلتی ہیں، ننگی ٹانگیں رکھتے ہوئے بازار میں پھرتی ہیں، دریاؤں میں تیرتی ہیں، جس چیز کو اچھا سمجھتی ہیں، انہیں خوف نہیں ہوتا کہ والدین مزاحم ہوں گے ،آزادانہ تعارف پیدا کر کے سیر کرتی ہیں۔ اس کی وجہ سے انہیں دماغی عیاشی کی اُس بدترین شکل سے واسطہ نہیں پڑتا جیسا آپ کے علاقے میں، سمجھتی ہیں۔ عصمت کو صرف اُس کے لیے سمجھتی ہیں جو کہ ان کی زندگی کا رفیق ہو، وہ بھی باقاعدہ نکاح کے بعد، پہلے نہیں۔ شاذ و نادر۔۔۔ ہاں! میں نے شاذ و نادر کہا اس لیے کہ محض ناتجربہ کار، مردوں کے وعدہ شادی میں آ کر عصمت پہلے ضائع کرتی ہیں، مگر یہ معاملہ بہت کم ہے اور ہو رہا ہے۔

اچھا اب رہا میں اور شاعری ، مجھے تم جانتے ہو، سراپا شاعر۔ دس بجے سے لے کر چار بجے تک تو باقاعدہ کام کرنا پڑتا ہے کالج میں۔ اس کے بعد کبھی ہم جاتے ہیں تو کبھی ہمارے پاس اُن کو آنا پڑتا ہے۔ پُرلطف باتیں ہوتی ہیں، حسن کا قصہ بھی چھڑ جاتا ہے، عشق کا ساز بھی بجتا ہے، مگر ہندوستانی ساز نہیں۔ ہم اپنی مشرقی روح کے ترانے گا کر انہیں سناتے ہیں، وہ اپنے مغربی ساز کے بین بجا کر رومان طاری کرتی ہیں۔ مگر حاشا وکلا، جو معاملہ اس سے بڑھا ہو۔ ہاں! ایک بار ایک اکیس سالہ کنواری لڑکی نے شادی کا وعدہ لینا چاہا۔ ہم نے کہا کہ ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر آپ ہمیں منظور فرمائیں مگر آپ جانتی نہیں کہ ہمارا مستقبل سلوں کی تنگ وتاریک کوٹھڑیاں یا سیسے کی کوئی منجمد گولی کا شکار ہونا مقدر ہو چکا ہے، کیوں قسمت کو خراب کرتی ہو۔ اس کا اصرار اس کے ساتھ اور بھی بڑھا۔ فرمانے لگیں کہ اگر تمہارے اندر یہ ہمدردیِ ملک وقوم کا جذبہ نہ ہوتا تو میں شادی کے لیے ہرگز نہ کہتی۔ آپ کی ظاہری وضع اور شکل سے زیادہ باعثِ تحریک میرے لیے آپ کے جذبات ہیں۔

خیر! اس وقت تک تو ہم نے معاملہ زیرِ غور رکھا ہوا ہے۔ شریف ہے، معصوم ہے اور پیار کرتی ہے۔ ہم بھی کرتے ہیں مگر بھائی! حقیقت یہ ہے کہ ہم شادی کے قابل نہیں۔

اچھا بھائی خدا حافظ، کبھی کبھی یاد کیا کرو تو عنایت ہوگی۔ تمہارے ملنے کو بالخصوص اس فضا میں جی بہت ترستا ہے۔

آپ کا وطن سے دور

عزیز

غزل

تنویر انجم

دمِ سحر جو کہیں نہیں تھا کوئی پریشاں خواب ہوگا
جو خلوتِ شب کے ساتھ ڈوبا وہ مہتابِ خراب ہوگا

نشہ عجب جس کے خواب کا ہے وہ کیسا جامِ شراب
میں جس کی خوشبو میں کھو رہوں گی ترے فسوں کا گلاب ہوگا

شبِ نیازِ طلب جو میں نے ہزار طرزِ جنوں سے کھولا
وہ درِ دل کا نصاب ہوگا، کتابِ وحشت کا باب ہوگا

زمین وافلاک دل میں رکھے جو خوگرِ آتشِ ازل ہو
وہ بے نیاز ثواب ہوگا، وہ ماورائے عذاب ہوگا

ابھی تمنّا کی سرکشی ہے میں کیسے یہ بات جان پاؤں
کہ بحرِ غم میں چلے گی کشتی کہ دل مرا زیرِ آب ہوگا

بہشت وہ اک جہاں میں ہوگی وہ ہوں گے ہمراہ اور انجم
نوازشوں کا شمار ہوگا نہ ساعتوں کا حساب ہوگا

ولادیمیر اِلیچ لینن

ولادی میر مایاکوفسکی

لینن ءِ آں اِشتغنت
کیندریں پُکانی بھیرا
حقیقتانی ہواڑیں آسہ اندرا۔
آنہیا سذت آنہانی ہورگیں دَوَرّغ۔
دراچغل داشغنت
کہ پُرژہ لبرٹی ،فریٹرنٹی او
ہےڈولیں لوزاں۔

مارکسزما
گوں مسلح بیثی آ،
جنگہ تیاری آکناناں،
دنیااندرا
چھڑو یکیں
بالشویک پارٹی۔

نیں ریاستاں دورہ آں کناناں
ڈیلکس ایں کُو پےءِ اندرا
مضبوطیں گاماں زیراناں۔۔۔
یاروسہ نیاما ژہ
ہر ہندے آ کہ تہ بےءِ
تراملنت
حرف
R.C.P،
گوں وٹی بریکٹ ایں گاوانڈی
B آ

مرثی
اے سہریں مارس و مریخ ایں
کہ خلاباز شکار کنغانتی،
دوربین بزاں ٹیلی سکوپ
یک بڑزیں برجے آ ژہ
آزمانا گھولغاینتاں۔

بلےدانڑتی ہماں عاجزیں حرف
کاغذیا گذانی چکا
جلشکی دنیا آ
دَہ ڈوڑزیات سُہراو روشن

***

لفظ۔۔۔
حتمی کہ کلاں ژہ جوائیں لفظ۔۔۔
دَوَرّغہ اندرا بدل بی انت۔
گوں استعمال و مٹ وسٹ آ
جاناکشی آ تار تار بیثغیں

مرثی
مس یک نوخیں
روژنائی اے داخل کنغہ لوٹاں
لفظاں ژہ شاندارتریں لفظ ءِ لافا:
پارٹی۔

فرد
تنہاو یکوئیں نفر
آنہی چے مطلب بیثہ بی
زیندھ ءِ لافا!
آنہی تہ تواردِہ
نزور معلوم بی
ژہ یک شیشن اے آوازا کہ جھلاکفی۔
کیئے آنہی ءِ اُش کنت!
چھڑو، شاید
آنہی زال،
اوآں دِہ ہماں وختا
کہ نزی موجودبی
او درا سوذا گرغا شتی آمہ وی۔

پر، یک پارٹی اے ءِ
یک قہر ناخیں،
سنگل ایں نعرہ اے طوفاں
منڈارے جی ثی آ
ژہ
کمزور اولاغریں آوازاں
اشی گُر ہاٹا گوں ٹکر ٹکر بنت
دژمن ءِ کلات
گوش ءِ پردہانی ڈولا
وختیکہ توپ ہُلجا آ
شروع کنت

چھڑو یک مڑدے
محسوس کنت مونجھ او معزولی آ
چھڑو یک مڑدے
موسمہ ٹاہینتہ نہ خنت
ہر کہنیں دھمکی
آنہی ءِ ناک آوٹ کنہ کنت۔۔۔
اگر بازیں لاغری یکجا بی انت

گوئنڈیں کسائیں
یک پارٹی موقف اے چکا---

اوہتھیاراں پُریں،
دژمن!
جہلاوفس
اوخاموش بی!
یک پارٹی اے
دَہ لکھ موڑ دغانیں دست
مشت بیٹھو یک مُکے بیشی آ
ٹکر ٹکر کنوخیں طاقت ئے۔

تو یک نفر چےایں؟
فضول---
بےکار

یک مڑد،
تو ٹریں کہ کلاں ژہ اِستور بی
دَہ گزیں پنجھرے زڑتہ نہ خشت،
بل اے ٹوکا کہ
دہ منزلیں بلڈنگے درٹینتہ بہ کنت۔
یک پارٹی اے مطلب ایں
ملینانی حسابا
دست، دماغ،
چم
اواری آ، یک ہندی آ کارءَ کنت۔
یک پارٹی اے اندرا
ماوثی پراجیکٹاں آزماناں دَہ
بڑزکنوں،
یک دوہمی ئے مذتا کشی آ
یک دگرئے مذتا کناناں۔

پارٹی
قطب نمائے ڈولا
ماردگہ چکّہ داری،
اے سجہ ایں ورکنگ کلاس ئے
رڈءِ ہڈیں
پارٹی
مئے کازئے لافانیت آ
عملی صورتہ داثاں،
مئے عقیدہا
کہ ہچبر نا کامہ نہ وی طبقہ۔
زی یک زیردستیں
مروشی ہمشی برکتا
اے سجہ ایں سلطنتانی نقشہ آں گار کنغئیں۔
دماغ،
طاقت اشی کلاسہ عظمت
ہمشیں مئے پارٹی۔

لینن
او پارٹی
جاڑیں براث انت۔
کئے گشی کہ تاں تک زیات اہمیتہ داری
پہ ہسٹری آ
کہ آنہانی ماثیں؟۔

لینن
او پارٹی
بازنز بخیں سیاد انت
یکے ناماگر
تو سمجھ کہ تہ
دوہمی ئے ناماگرغائیے

اسباب وعلل

ابو امریز

روش پیشہ سوانیزہ
ڈوکانی گڑوکاٹیں
گہانچاں پینچشہ چپاَ
مئیں دوپس رستراواڑتہ
رغام بستو بغاپیشہ
چاردہ، ماہ گوا گپتہ
چم ءِ شیر پرَ ینی
پارکرپین گاریشہ
پُلاں بند کشہ برشکند
دوست وبرادری رنجا
منظوریں سکیم کینسل
ہچ کارے نہ گیڑ دگا
چکا گل زمیں نیلی
تلشکاں راستغیں دگاں
گنداں گندغیں وہاواں
سوالئیں دِہ چپی ایں
کہ
''مئیں جوائیں یار زہر گپتہ''

شُکرُ

گُرک

بندائنت چم منی
سرجہلیں
زُنڈوکنڈ ژہ پیڑھی آں
چوہشتر بندے جی زاں بندی
چنک مئیں دراژنتاں دعایانی
اللہ دے مناں راست و رژن
راست ورژن، بلی راست ورژن

دوستی نصیواوں بی سائنسا گوں
پورہاتی عوام سنگت بی
رہ شوں بی منی اے نعرہ:
''جہان ئے مزدوراں یک بی ایں''۔
امن وایمنی مقصد بی۔
تنظیم وشعورانسان ئے
ودّھینغ منی پیشغ بی۔

شیطاں کاتک گوں دروہی آں
اَلّی میوہاں بہشت ایغاں
ہژمباں دامناں آسئے غاں
کہ ڈولے دل منی اِنگوبی

ریاست گوں وثی لٹ کٹاں
ملاگوں وثی دراژ گٹاں
دانشوراوثی چرپیں لوز
کل مئیں ڈوبرا اُررِتکاں

بازیں نعمتاں لوٹی دل
بلوچانی وطن آبادبی
نرم بی چاڑدھی ماہئے غا
استار جلشکنتی ہرتلّا
امن وایمنی نصی باثی

آبادبی بلاں آزادبی
پرمس جوانی آسئی زانتاں
اے ہچبر یہ مڑی کارے نہ ایں
لوٹی صدہزار ورنایاں
آں کہ جوانی آزانت داراں
تنظیم ڈسپلن پکوبی

گڑہ صبروسکھغ وگہہ گیری
اومیث ویقیں ھِیل وندی
پوڑہات وہنر خاموشی
کارنت، واہری اللہ دیا
سموءِ نغاہ، نیخہ باں
مست ئے چمبو و راہ شونی

پوڑہاتوں کشہ یہ درمس
جاہے گڑتغاں ناکامی
آوار آڑتغاں جاہے مس

چنک مئیں پُرءباں سوکائی
دامن دِہ سرنہ یئے ہورگی آ
اے پیری آولہ ایں ورنایاں
میوایاں، گہیں باغانی

یک جاہیثغنت ''پوہ زانتا''
''سنڈے پارٹی''اِش ٹاہینتہ
میٹنگ، مقالہ او بحث وتران
کمیٹی، کانگریس، تنظیم ئے
قرارداد جلسہ ئے ہروختا

شُکریں یاھذا سوزیں تئی
ہورگی نہ رواں شیذاں مس
ورنا گونڈلیں پذریشاں
کہ مَین انتاں وثی ملکا پہ
صذ گنجیں ''بلوچس تانا'' پہ
شیدا اینت وثی مخلو کئے
آخر کہ رواں کامیاب بنت
بوڑاں دریچہ ہاں بہشت ایغاں
کارنت روش و ماہ استاراں

دکھ

آمنہ ابڑو

عمر......
اظہار کئے بغیر،
محبت کرنے میں گزاردی،
چاہَ کو بیان کرنے کے لئے
جو ہنر درکار تھا
اس کی ریاضت
کا وقت ہی نہ ملا۔
یوں میرا عشق۔۔
تادمِ آخر، گمنام رہا۔

ایک معیاری کتاب

عبدالمطلب مینگل

تنقید کو سائنس بھی کہا جا سکتا ہے۔ سائنس کا کام منفی اور مثبت کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس لیے کسی شخص کا بحیثیت نقاد کسی چیز کے معیار کو پرکھنا اور جانچنا انتہائی عرق ریزی کا کام ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تنقید تو بہت کی جاتی ہے مگر یہ تنقید منفی اور غیر ادبی رجحان کا سبب بنتی ہے۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو تنقید کا کام اُس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر طرف معیاری ادب اور اعلیٰ معاشرتی روایات پروان چڑھ چکی ہوں۔ ایسی صورت میں چوں کہ تمام چیزیں معیاری ہوتی ہیں۔ اس لیے تنقید کی زیادہ ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اگر ہمارے ہاں حکومت سے لے کر سیاست تک، معاشرے سے فرد تک ہر طرف مایوسی اور غیر سائنسی رجحانات عام ہو چکے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ معاشرتی رہنمائی کا فقدان ہے۔

ایسے ماحول میں اگر کوئی مثبت سوچ اور نظریے پر قائم ہے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ایسی سوچ اور فکر کا مالک جاوید اختر وہ شخص ہے، جو محنت اور محبت کا پروانہ لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس کی محنت کا ثبوت اس کی علمی و ادبی خدمات ہیں اور جس شخص کا ہاتھ جمالیات کی نبض پر ہو تو وہ کیوں کر محبت سے دور ہو سکتا ہے۔ اُس کی محبت کا جذبہ آفاقی ہے۔ اس نے جمالیات پر پوری کتاب "لینن اور جمالیات" کے نام سے لکھ کر محبت کے قافلوں کے نام کی ہے۔

زیرِ نظر کتاب اُس کی تازہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کا مواد اچھی موسیقی کی طرح بااثر ہے، جس کو بار بار سننے کے باوجود دل نہیں بھرتا ہے۔ اس لیے یہ کتاب بار بار پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ کم از کم مجھے ایسی کم کتابیں ملیں، جن کے پیراگراف بار بار پڑھنے سے اکتاہٹ نہیں ہوتی ہے۔

اس کتاب کو "سنگت اکیڈمی آف سائنسز" کوئٹہ نے چھاپا ہے۔ یہ 128 صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کا انتساب کچھ اس طرح ہے "بھگت سنگھ اور اس کے کامریڈوں کے نام، جنہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر آزادی او سوشلسٹ انقلاب کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا"۔ یہ کتاب 500 روپے ہدیہ کے ساتھ مری لیب شیر محمد روڈ کوئٹہ سے دستیاب ہے۔ اس کتاب کی فہرست کے مطابق "پیش لفظ" ڈاکٹر شاہ محمد مری نے لکھا ہے۔ اور صاحب کتاب کے "دیباچہ" کے علاوہ یہ کتاب "سجاد ظہیر کی تنقید نگاری"، "ظہیر کاشمیری کی تنقیدی جہات"، "علی سردار جعفری کی تنقید" اور "فیض بہ حیثیت نقاد" ایسے ابواب پر مشتمل ہے۔

Valentine's Day

سندھو پیرزادہ

محبوب کو چومنے کا احساس
نظم میں قید نہیں کیا جا سکتا
زمین کو پڑھنے کے لیے
درختوں کی زبان سیکھنی پڑتی ہے
ہوا کے سفید گھوڑے پر چڑھ کر
جب کائنات سے آگے نکل جاتی ہوں
تو محبت وہاں سے شروع ہوتی ہے
جوانی کا خمار
آنکھوں میں اتر آتا ہے
شام لڑکھڑاتی ہوئی
رات میں داخل ہو جاتی ہے
اسی لمحے
Valentine's Party
جھومتی رہتی ہے
پوری رات رقص کرتے
لڑکے اور لڑکیوں کی آنکھیں
وہیں رہ جاتی ہیں
پھولوں کی دکانوں پر رش بڑھ جاتا ہے
زبور میں حضرت ڈیوڈ کے گیت
گونجتے رہتے ہیں
ایک رومی لڑکا
اپنی محبوبہ کے گال چوم کر
اسے
Valentine's Day
Happy
کہتا ہے
سینٹ ویلنٹائن کی زمین پر
لال گلاب کھل اٹھتے ہیں
بائبل کے صفحات سے نکل کر
محبت محوِ رقص ہے
اور چرچ میں یسوع کا مجسمہ
مسکرانے لگتا ہے۔۔۔۔

البلی

آغا گل

مزدوروں کا جلوس نعرے لگاتا فیکٹری کی جانب بڑھ رہا تھا۔دیگر مزدور اور مزدور تنظیمیں بھی ان کی حمایت میں ساتھ شامل ہوئے جاتے تھے۔فرید فیکٹری میں دیگر مزدوروں والی وردی پہنتا مشینوں اور پروڈکشن کا جائزہ لیتا تو اکثر نہ پہچانتے کہ کون ہے۔وہ اسے سر پھرا سپروائزر سمجھتے۔جو لاپرواہی سے گھومتا پھرتا۔مزدوروں کے برعکس اس کا چہرہ بھی گڑھوں نشیبوں اور پریشانیوں سے مبرا رہتا۔

جرمنی سے تربیت حاصل کر کے لوٹا تو غلامی کے رویے اس کے ذہن سے نکل چکے تھے۔جرمن کبھی کسی کے غلام نہیں رہے۔جبکہ برصغیر ہزاروں برس سے غلام تھا کبھی اپنوں کا کبھی غیروں کا۔غلامی اور بھوک ان کے جینز کا حصّہ تھا،بلا سبب خوشامد کرنا جھکے جانا اور کھانا دیکھتے ہی ٹوٹ پڑنا۔وہ چاہتا تھا کہ نظام میں شامل ہو کر سمجھ کر فیکٹری کو مثالی بنائے۔لیکن ادھر گڑبڑ بہت تھی کچھ بھتہ تو بھائی لوگ اور سرکاری محکمہ لے جاتے۔جنت جنت الاپنے والے۔جنت بی بی کے نام پر بھتہ نما چندہ لے جاتے۔کارخانہ دار کچھ حیل حجت کرتا تو اسے قادیانی کا لیبل دکھاتے جو اس پہ فقہی ایلفی سے چسپاں ہو سکتا تھا۔جیسے سیاہ کار کا لیبل لگے تو اسے پھر قوم قبیلہ بھی بچا نہیں سکتا۔

سبھی کارخانہ دار ان کے ہاتھوں یرغمالی جون پور کا قاضی بنے رہتے۔کچھ تو رسہ تڑا کر بنگلہ دیش جا بسے تھے جہاں فیکٹری مالکان کو تحفظ دیا جاتا۔

پاکستان میں کامیاب رہنا ایک سائنس بھی ہے آرٹ بھی۔فرید کا گھرانہ بخوبی یہ فن جانتا تھا۔مزدور نعرے لگاتے بڑھتے چلے آئے تھے۔فیکٹری گھیر کے نعرے لگاتے دھرنا دیتے تو باہر نکلنا دشوار ہو جاتا۔اس لیے وہ جاوید کے ہمراہ اسکی آلٹو میں فیکٹری سے فرار ہوا تو سیکورٹی نے جاوید کے لیے گیٹ کھول دیا۔مزدوروں کی وردی پہنے وہ آلٹو میں گزرتے تو جلوس انہیں اپنا ساتھی سمجھ کر جانے دیتا۔فیکٹری مالک کی گاڑی تو وہ کبھی نکلنے نہ دیتے۔کیا عجب پتھراؤ بھی کر کے گاڑی کا ملیدہ بنا دیتے۔

جلوس نے اسے راستہ دیا،مزدور پیدل ہی آہستہ خرامی سے چلے آرہے تھے۔جلوس کے آگے مزدور لیڈر تھے،جن کے ساتھ ہی ایک حسینہ درگا دیوی کا جمال و جلال اوڑھے چل رہی تھی۔اس کے سر پہ بھگوان سا تاج تھا۔اس کی سندرتا دیکھ کر فرید وہیں ڈھیر ہو گیا۔'' ہائے یاسین' وہ زخمی دل سے کراہا۔

''جاوید یہ کون ہے؟'' جاوید سہم گیا۔

''باس اس کو نظر بھر کے نہ دیکھنا۔یہ شہر کی Heart Throb ہے۔قلوپطرہ،پتھر کی دیوی،یہ حسن کی تارا مسیح ہے۔اپنے گھائل کو لونڈی کی طرح کہتی ہے'پراں مر'۔اس کا مشہور نام البلی ہے۔کیونکہ بالکل البلی ہے۔نہ لباس کی پرواہ۔نہ میک اپ کا سلیقہ نہ ہی اپنے حسن کی طاقت کا اندازہ''

''گاڑی روکو'' فرید نے حکم دیا۔

''نہیں باس میں آپ کے خاندان کا وفادار ہوں۔بے موت نہیں مرنے دوں گا''

فرید نے گھونسا تانا'' روکتا ہے کہ لگاؤں ایک بزناٹ وفادار کا پتر۔بات مانتا نہیں اور کرتا ہے وفاداری''

جلوس نے آلٹو سے مزدور نکلتے دیکھا تو ذرا بھر اچنبا نہ ہوا۔وہ بھی پہلی صف میں مزدور لیڈر ابراہیم کے بازو میں جگہ بنا کر چلنے لگا۔البلی عورتوں کے گروپ میں تھی۔اس کا حسن جہاں سوز راکھ کیے دے رہا تھا۔فیکٹری کے گیٹ بند تھے۔فرید نے مشورہ دیا کہ صرف تین لوگ اندر جائیں وہ ابراہیم،اس کی بیٹی بطور نمائندہ۔ابراہیم کے خطاب پر مزدور دھرنا دے کر سڑک پر ہی بیٹھ گئے۔یوں فیکٹری کے آمد و رفت کا راستہ بند کر کے بیٹھ رہے۔رضا کار پلاسٹک کی بوتلوں میں پانی بھر بھر کے بانٹتے پھر رہے تھے۔

فرید نے گیٹ بجایا تو سیکورٹی نے چھوٹی کھڑکی سے جھانکا۔فرید کو دیکھ کر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

''ہم منیجر سے بات کرنا چاہتے ہیں'' فرید نے نرمی سے کہا۔

ذرا سی دیر میں منیجر دوڑا آیا۔موقعہ کی نزاکت کے تحت اس نے جمعہ خانی کی فرید کو نہ پہچانا۔

البلی اس پہ برس پڑی'' آپ نے تین مزدوروں کو نوکری سے نکال دیا ہے۔ان کی روزی روٹی کا کیا بنے گا؟'' اشتعال میں وہ دمک اٹھی جیسے پندرہ کیرٹ کا قابلی یاقوت اچانک ہی جلتے سورج کے سامنے رکھ دیا جائے۔ابراہیم اپنی بیٹی کے جارحانہ رویے سے خوش نہ تھا۔نرمی سے بولا۔'' ہم صرف درخواست کرتے ہیں کہ انہیں دوبارہ کام پر رکھ لیں گے۔ان کی تنخواہ سے کہیں زیادہ تو سیٹھ کے دفتر میں اے سی کا بل آتا ہو گا''

منیجر نے عالم بدحواسی میں بتیسی نکال دی'' دراصل نئی مشینوں اور روبوٹس کے باعث نفری کی ضرورت نہیں رہی......؟'' البلی نے اسے فقرہ پورا نہ کرنے دیا۔'' ہم آگ لگا دیں گے ان روبوٹوں کو جو مزدوروں کا حق چھینتے ہیں۔''

فرید محتاط انداز میں اس کے جلوؤں سے سرشار ہوتا رہا۔منیجر کھسیانے لگا'' یہ تو ممکن نہیں ہے''

البلی اندھیری راتوں کی طوفانی بجلیوں کی مانند کوند گئی'' تو میں اپنے آپ کو اسی گیٹ پر آگ لگا لوں گی''

ماحول اچانک ہی اشتعال انگیز ہو گیا۔مزدور حملے کے لیے پر تولنے لگے۔فرید نے آواز لگائی'' جاوید لاؤ پٹرول کی بوتل' جاوید گاڑی ایک جانب لگا کر پانی کی بوتل لیے ساتھ ساتھ ہی چلا آیا تھا۔اس نے کچھ جھک

کر پہلو بدل کر یوں لیبل اتارا کہ مجمع نہ دیکھ سکا اور پانی کی بوتل تھما دی۔فرید نے بوتل سر سے بلند کی۔

البلبلی چیخی ''نہیں میں مروں گی'' اس نے بوتل جھپٹنا چاہی۔مگر وہ بونی سی تھی ہاتھ اتنا بلند نہ کر پائی۔منیجر کے ہوش اڑ گئے۔مالک اس کے سامنے کھڑا ڈرامہ کر رہا تھا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں'' منیجر رونے پہ آ گیا تھا۔

''ان تینوں مزدوروں کو کام پہ رکھ لیا جائے''

فرید نے گرج کر کہا۔منیجر جھک سا گیا۔''حکم کی تعمیل ہوگی۔اگر وہ جلوس میں موجود ہیں تو فیکٹری میں چلے آئیں''

زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے مزدوروں نے فرید اور ابراہیم کو کندھوں پہ اٹھا لیا، عورتیں البلبلی کے لیے نعرے لگاتیں راہ لگیں، مین روڈ پہ جلوس منتشر ہوا تو ابراہیم نے فرید کو کھانے کی دعوت دی۔کچھ ہی دور ایک ڈھابے میں وہ چاروں بیٹھ گئے۔تعارف ہوا۔البلبلی کا نام کنزہ تھا، عجب سا نام تھا جیسے ریلوے کا انجن قریب سے تیز سیٹی بجاتا گزر جائے۔

البلبلی نے فرید کی بوتل کھول کر سونگھی ''میں بھی حیران تھی کہ تم راستے میں پٹرول پیتے آئے ہو''

فرید ذرا نہ جھینپا ''کیا کروں ظالموں سے حق تو لینا ہی پڑتا ہے''

ابراہیم نے عمر بھر مزدور تحریک نبھائی۔جیلوں میں رہا۔سڑکوں پہ بید اور آنسو گیس برداشت کرتا رہا۔مزدوروں کے علاقے میں دو کمرے کا کواٹر تھا۔جس میں کتابیں ہی کتابیں تھیں، گیان کی دیوی سرسوتی وہاں رہتی جس کے باعث دولت کی دیوی لکشمی پہلو بدل کے اس کوارٹر سے گزر جاتی، بھلا ایک ملک میں دو بادشاہ یا ایک نیام میں دو تلواریں رہی ہیں۔فرید تو منجھا ہوا Sapper تھا فصیلوں میں شگاف ڈالتا داخل ہو جاتا۔یہ لڑکی تھی تو بے حد دلکش مگر Lilliputian مخلوق تھی ننھی منی سی جسے سردی میں اوورکوٹ کی جیب میں بھی ڈالا جا سکے۔سامنے کافی کے دو پیالے اور عقب میں دو گلاؤ۔وہی بونی مخلوق جس نے سینڈریلا کی مدد کی تھی۔اب مزدوروں کے لیے کام کر رہی ہے۔فرید کو تاسف ہوا اسی کوشش میں جھلس جائے گی۔دادا امیر حیدر کی طرح ناکام و ناکارہ رہ کر بھی فیکٹریوں میں تقریریں کر کے سرمایہ داری نظام کو برا بھلا کہتی پھرے گی۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ بے تکلف ہو گئے، اشارہ پاتے ہی جاوید کھسک چکا تھا۔

''کھانے کا بل میں دوں گی'' البلبلی مچل گئی۔

''ہمارا گھر ساتھ ہی ہے چلو گے؟ چائے پلاؤں گی؟''

ابراہیم نے دریا دلی دکھائی ''ہمارے گھر میں بہت کتابیں ہیں۔جو چاہے دے دوں گا یہ تو ہے بھی انگریزی ادب کی''۔

شکار خزنہ کے قریب ہی چلا آ رہا تھا۔وہ بس میں بیٹھ کر دھول اگلتی مزدور بستی میں آ گئے۔وہاں غربت و بدحالی تھی جیسے قدیم غلام عبرانیوں کی مفتوحہ بستی رہی ہو۔فرش پہ دریاں بالشت ڈھیروں اخبار اور انگریزی ادب کی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔گھر میں غربت کی جاتو نوکیلے خون آشام دانت نکوسے براجمان تھی۔ظاہر ہوئے بغیر وہ اپنا وجود منوا رہی تھی۔البلبلی نہایت ہی بے رحمی سے سچ بولنے کی عادی تھی۔

''میں تو کبھی کسی کو لفٹ نہیں کراتی مگر تمہاری دلیری سے میں عش عش کر اٹھی۔وہ مرد ہی کیا جو دلیر نہ ہو''

ابراہیم سگریٹ لینے باہر نکل گیا۔اسے اپنی بیٹی پہ بھروسہ تھا۔لیکن وہ اسے گفتگو کا موقعہ دینا چاہتا تھا۔اس کی دلی خواہش تھی کہ بیٹی شادی کر کے گھر بسائے۔

مگر شادی کے نام پہ وہ مرنے مارنے پہ تل جاتی۔خودکشی پہ آمادہ ہو جاتی۔کئی بار اس نے خودکشی بھی کرنا چاہی۔اس کی پاگلانہ الفت سے ابراہیم بھی سوختہ تھا۔فرید سے التفات دیکھ کر ابراہیم کی ہمت بندھی۔کنزہ کو پسند کا ساتھی تو ملا۔فرید دوستوں کے منع کرنے کے باوجود دھیرے دھیرے چاہت آگے نہ بڑھاتا۔بلکہ کسی مارشل لائی حکومت کی طرح بوٹوں سمیت دل میں در آتا۔

''میں تو بس تمہیں دیکھتے ہی ڈھیر ہو گیا۔دل گردے والا انسان ہوں ورنہ وہیں خاک ہو جاتا''

خلاف توقع البلبلی نہ شرمائی۔''ہاں میں نے تمہیں کار سے اترتے دیکھا تھا۔مگر تم کسی طور مزدور نہیں لگتے تمہارے ہاتھ بھی مزدوروں والے نہیں ہیں۔'' فرید نے موضوع بدل دیا۔

''صرف ایک کپ، سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم'' وہ رسوئی میں گئی تو فرید بھی پیڑھی گھسیٹ کر ساتھ آ بیٹھا۔

''سوموار تمہارا برتھ ڈے رہا ہوگا۔اتنی حسین لڑکی بنانے میں قدرت نے لونگ ویک اینڈ تو لیا ہی ہوگا''

اپنی تعریف وہ کسی سنتری کی مانند پتھریلے چہرے سے سنتی رہی عجیب سی Petrified لڑکی تھی۔کوہ ہر بوئی کی چار چشم جیسی جسکی ہر آنکھ لاتعلق تھی۔زندگی کی دمک سے عاری پتھر سی۔

پہلی ہی ملاقات میں ان کی دوستی ہو گئی۔ابراہیم بھی خوش تھا کہ کنزہ کو جیون ساتھی مل جائے گا۔ورنہ وہ تو ہمیشہ انکار کرتی آئی تھی۔اچھے اچھے رشتے ہاتھ سے گئے۔دو ایک تو شہر ہی چھوڑ گئے۔ایک نے تو نیند کی گولیاں پھانک کر خودکشی کی کوشش کی وہ تو کرم ہے جعلی دوائیاں بنانے والوں کا۔جو وہ بچ رہا۔

فرید بدستور غریب کا روپ دھارے آتا جاتا۔جاوید کی آلٹو سے اتر کر وہ اگلے اسٹاپ تک بس میں آتا۔پھر وہ البلبلی کے ساتھ ہی بس میں ساحل پہ جاتا اور نسبتاً سستے ریستورانت میں کھاتے پیتے۔یہ لڑکی فرید کو اہرام مصر کی طرح پراسرار سی لگتی اسے ٹارگٹ کرنا مارخور کے شکار سا مشکل تھا۔

شام میں اب اس کی یہی تفریح رہتی۔البلبلی بھی ہاتھ تھامے ساحل کی گیلی ریت پہ ساتھ چلتی پھر وہ بازو کمر پہ آنے لگا، بوس و کنار میں بھی کچھ ہی دن لگے مگر ہم آغوشیاں ممنوع رہیں۔

ایک سہ پہر جب آگ سہتی زمین بھوبھل بنی شام کی راہ دیکھ رہی تھی، جاوید سے برداشت نہ ہو سکا ''باس بہت بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں۔میں تو اس بدبودار بستی میں رانی مکھر جی کے لیے بھی نہ آؤں۔واقعی عشق

خاک چھنواتا ہے۔مگر مجھے تسلی ہے کہ قلعہ فتح کر کے جھنڈا گاڑ کے پھر آپ دوبارہ مفتوحہ علاقے میں نہیں جاتے''

فرید مسکرایا''کبھی دیکھا سنا کہ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر کے جھنڈا گاڑ کے کوئی وہی ڈیرہ ڈال بیٹھا ہو''

جاوید ہمدرد انسان تھا''بلا تردد فون کرنے پر ہی آپ کی شام رنگین کرسکتا ہوں باس''

فرید کو اس کی سادگی اچھی لگی''جب ہم شکار پہ جاتے ہیں تو ایک تیتر ہزاروں کا پڑتا ہے، کہاں شکار کرنا کہاں بازار سے خرید لانا۔تم یہ فرق نہیں سمجھو گے۔پہلے شکاری بنو''۔

جاوید نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے''یہ امیروں کے شوق ہیں مجھے تو اللہ نے بچا رکھا ہے، شکر ہے''

البلبلی کسی دھرنے میں اظہار یک جہتی کے لیے لیبر کالونی کی خواتین کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔اس نے موبائل پہ یہی وقت دے رکھا تھا،مگر ٹریفک میں گروپ پھنس گیا ہو۔کیونکہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ ہی افورڈ کرسکتی تھی۔ابراہیم حسب معمول گرمجوشی سے ملا،بکھری ہوئی کتابیں اخبار سمیٹ کر بیٹھنے کی معقول جگہ بنائی۔اور رسوئی میں جا کر دو کوپ چائے بنالایا۔

''فرید میں تمہیں آج حقیقت حال سے واقف کرنا چاہتا ہوں''ابراہیم کا لہجہ پراسرار ہوگیا۔وہ نظریں چرا کر بات کر رہا تھا۔فضاء کی تپش سے پنکھا بھی بجائے راحت دینے کے جسم پر استری کیے جا رہا تھا۔

''کنزہ میری اپنی بیٹی نہیں ہے''فرید کے ہاتھ میں کوپ کانپ گیا۔وہ ایڈگر ایلن پو کی کہانی سن رہا تھا۔

''میری بے حد پیاری بیوی اور دو بچے ٹریفک حادثے میں جان سے گئے۔دل ویران ہو کے رہ گیا۔یوں تو مزدوروں کے جلسوں میں گرجتا برستا مگر دل ٹوٹ چکا تھا۔مجھے ویران ساحل اچھے لگتے۔فجر کی نماز کے بعد بائیک لیے ساحل پہ جا پہنچتا۔ایک صبح کاذب لہروں کے طلاطم میں چٹانوں کی جانب سے بچی کے رونے کی آواز سنی دوڑ پڑا۔دیکھا کہ ایک آدمی نے کوئی آٹھ نو برس کی بچی لہروں میں اچھال پھینکی لہر پلٹی اور دوبارہ ریت پہ دے مارا۔میں دیوانہ وار دوڑا وہ دوبارہ بچی کو پھینکنے کے لیے بانہوں میں بھر چکا تھا۔میں نے زور کا گھونسہ جڑا مزدور کے ہاتھوں کی طاقت تم جانتے ہو۔میں نے اسے ریت پہ دے مارا اور چاہا کہ فولادی مکے سے اسکا منہ توڑ دوں کہ وہ بچی اس پہ آن گری اور مجھے ننھے منے ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔مت مارو میرے پاپا کو۔وہ بری طرح بلک رہی تھی میں نے اپنا ہاتھ روک دیا ہم لہروں کی زد میں تھے اچانک ایک بڑی لہر آئی میں تو ریت سے چپک گیا، واپس جاتی لہر بچی کو بھی ساتھ ہی لے چلی۔میں نے چھلانگ ماری اور موجوں سے لڑتا بچی کا پاؤں پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔لگتا تھا کہ بچی کو بچانے میں خود بھی ڈوب جاؤں گا،مگر میں نے ہمت نہ ہاری میں با آواز بلند اللہ کو پکار رہا تھا۔اس ادھ موئی بچی کو لے کر ساحل پہ آن گرا اسکا باپ غائب ہو چکا تھا۔میں بچی کو لیے گھر آیا۔میں نے دل کے زخم نہ کریدے۔کوئی سوال نہ کیا۔کنزہ اس نے اپنا نام بتایا تھا۔وہ خاموش رہتی کونوں میں دبک کر بلا آواز روتی رہتی۔رات کو بستر میں یوں آنسو بہاتی کہ مجھے بھی خبر نہ ہوتی۔صبح تکیہ بھیگا ہوتا۔چائے پیو ٹھنڈی ہو رہی ہے''

فرید خاموشی سے چائے پیتا رہا۔گرمی میں جلتا سلگتا وقت دم سادھے کمرے میں منجمد سا ہوگیا۔گرمی میں بھی فرید کا لہو سرد پڑ گیا۔

''میری دلی خواہش ہے کہ تم کنزہ سے شادی کر لو۔محبت نہیں کر سکتے تو رحم ہی کھاؤ،تم لاکھ غریب بنو۔میں جانتا ہوں کہ تم کوئی با اثر متمول انسان ہو۔لوگ تمہیں دیکھ کر باادب ہو جاتے ہیں''

فرید بدستور خاموش رہا۔پھر ہزاروں سال بعد اس نے کہا''اچھا چلتا ہوں، شاید کنزہ اس دھرنا کا حصہ بن گئی ہے''ابراہیم کی نمناک آنکھیں دیکھ کر اتنا ہی کہہ سکا۔

''وقت پر فیصلے چھوڑ دیں''

جاوید کی آلٹو میں پھنسا لوٹ رہا تھا کہ البلبلی کا فون آیا''بے ایمان، فرار ہوگئے۔میرا انتظار بھی نہ کیا''وہ لوٹ پڑا فرید کو Pensive دیکھ کر وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''کل ہم حیدر آباد جا رہے ہیں، بڑا جلوس ہوگا۔ساتھ چلو گے؟''

فرید پھانسی پہ جھولتا رہا''ہاں چلوں گا''

اس نے پاؤں گھاٹ پر ٹکا کر گلے سے رسہ اتار لیا۔کہیں یہ جذباتی لڑکی گلے میں ہی فٹ نہ ہو جائے۔

حیدر آباد کا سفر رومینٹک تھا۔آلٹو فرید چلا رہا تھا۔کلینڈر سائڈ پہ البلبلی ضوفشاں تھی۔پچھلی سیٹ پہ ابراہیم اور جاوید تھے۔البلبلی کے حسن سے سرشار وہ آلٹو بھی فراری کی طرح دوڑائے جا رہا تھا۔جاوید نے بکنگ کرا رکھی تھی، گیسٹ ہاؤس دیکھ کر البلبلی ٹھٹھک گئی۔

''اس کا کرایہ کون دے گا''جاوید مسکرایا۔

''میرے چچا کا ہے مفت ہے ہمارے لیے''البلبلی کے لیے لان درخت اور پرسکون گیسٹ ہاؤس خواب آگیں تھا۔چار کمرے بک تھے۔وہ ایئر کنڈیشن کی سرد ہواؤں میں بستر پہ ڈھیر ہوگئی۔کھانا کھا کر ابراہیم مزدوروں سے ملنے جاوید کے ساتھ چلا گیا۔

فرید نے دروازہ بجایا اور اندر چلا آیا۔پرسکون کمرے کی دھیمی روشنی میں البلبلی قدیم اپسراء سی لگ رہی تھی۔اچانک ہی فرید دیوانہ ہو کر سارے جھوٹے وعدے بھول بیٹھا۔منٹو کے افسانے کالی شلوار اور وہی وہانوی کے ناول گیلی شلوار کے پنے الٹتا البلبلی کو وہ بے بس کر کے قابو کر چکا تھا کہ اچانک ہی اس کی چیخ بلند ہوئی۔وہ گھبرا کے یوں اچھلا کہ بدحواسی میں پشت دیوار سے جا ٹکرائی۔واسوکی کا زہر اس کے جسم میں پھیلتا ہی چلا گیا۔

اس نے خود کو سنبھالا اپنا لباس درست کیا اور گیسٹ ہاؤس سے پیدل ہی نکل گیا۔جب اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ ایک ڈھابے میں بیٹھا ہے۔سامنے ٹھنڈی چائے دھری ہے۔موبائل تو البلبلی کے کمرے میں ہی گر چکا تھا۔اس نے رکشہ پکڑا اور گیسٹ ہاؤس میں لوٹ آیا۔سبھی اس کے لیے پریشان تھے۔جلسہ کامیاب رہا تھا۔البلبلی کی تقریر نے تو آگ لگا دی تھی مزدوروں میں نئی روح پھونک دی تھی۔عورتوں کے نعرے مردوں سے بھی بلند ہو گئے تھے۔دبے ہوئے مزدور ایک بپھرے ہوئے طوفان میں منقلب ہو چکے

تھے۔البلی کے چہرے پہ غم کے بادل تھے۔مگر روپے اور گفتگو ویسے ہی تھی۔رات کے کھانے کے بعد البلی نے بوٹنگ کی فرمائش کی ادھر روپے کی کیا کمی تھی۔کشتی دریا میں تیر رہی تھی،البلی کسی کی پرواہ کیے بغیر ہی فرید کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔ابراہیم نے خفت سے تاریک دریا پہ نظریں جمادیں۔دیگر مزدور لیڈر بھی بدحواس ہوکر ادھرادھر دیکھنے لگے۔

''فرید اپنی محبت واپس لے لو۔مجھے تکلیف دے گی''

البلی نے انگوٹھی اتار کر فرید کی جیب میں ڈال دی۔

''مجھے بچپن سے ہی ایک شعر بہت اچھا لگتا ہے۔

دفنانا دیکھ بھال کے حسرت زدہ کی لاش
لپٹی ہوئی کفن سے کوئی آرزو نہ ہو

یہ محبتیں یہ مایوسیاں کفن سے لپٹی چلی آئیں تو میں کیا کروں گی۔اسی لیے تو غالب نے ڈوبنے کی آرزو کی اور ورجینا ولف لباس میں پتھر بھر کر دریا میں جا ڈوبی تھی۔آئی لو یو فرید''

اس نے سب کے سامنے لپٹ کر فرید کا بوسہ لیا۔سبھی بھونچکے رہ گئے۔ابراہیم کے تو پسینے ہی چھوٹ گئے۔اس سے پہلے کہ کوئی ہوش میں آتا البلی اٹھی اور تلاطم زدہ اندھیرے دریا میں کود گئی۔ابراہیم کو دریا میں کودنے سے ملاحوں نے روکا،ابراہیم کنزہ کنزہ پکارتا ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔مزدور لیڈر کشتی میں جھک کر اندھیرے پانیوں میں آوازیں دے رہے تھے۔

جاوید یوں تو رو رہا تھا مگر فرط غیض سے اس نے فرید کا گریبان پکڑ لیا۔

''یہ کیا ہو گیا باس'' وہ فرید کو جھنجوڑ رہا تھا۔

''کیوں وہ دریا میں کود گئی''

وہ فرید کو ہی قاتل قرار دے رہا تھا۔فرید یوں تو پتھرا چکا تھا۔اس نے نرمی مگر طاقت سے جاوید کے ہاتھوں سے گریبان چھڑاتے ہوئے سرگوشی کی'' وہ خواجہ سراء تھی''

البلی: FreeCare

گلگت کے قریب وہ مقام جہاں قراقرم۔ہندوکش۔ہمالیہ آن ملتے ہیں۔مجاز اُقدرت کا کمال۔

بزناٹ: زوردار مکہ

جمعہ خان: جان کرانجان بننا

گلاؤ: خربوزہ

خزہ: مورچہ

جاتو: چڑیل

Petrified: درخت کا پتھر بن جانا۔

ہائے وہ شہر دل آرا میرا !!

نسیم سید

اب کے گھر لوٹ کے جانا تو
نگاہوں میں بسے
سارے شاداب مناظر کو
بھلا کر جانا
جاگ کے سوچوں میں
خوابوں میں بتانا نہ سفر
شہر سے اپنے ملو گے
تو بہت دکھ ہوگا
راستے وہ
جو قدم تھام لیا کرتے تھے
اب تو آہٹ بھی کوئی سن کے
لرز جاتے ہیں
جہاں آوازوں کا
میلہ سا لگا رہتا تھا
صحن وہ غیر تو کیا
اپنوں سے گھبراتے ہیں
شادماں گلیاں
نہ بچوں کی وہ چہکاریں ہیں
جس طرف دیکھو گے
دیواریں ہی دیواریں ہیں
وہ جو اک شہر تھا
پرشوق وپرامید ویقیں
وہ جو مہتاب سے
تعمیر کے خط کھینچتا تھا
اب وہی بھور تلک
درد کے بستر سے لگا
موت کی چاپ
اندھیرے میں سنا کرتا ہے
شب کو گہنایا ہوا
صبح کو جلایا ہوا
ایک مٹیالی سی
مجبوری کی چادر اوڑھے
کسی امید کی ڈیوڑھی سے
کمر ٹیکے ہوئے
کھوٹے سکے لئے خوابوں کے
گنا کرتا ہے
اب کے گھر جانا
تو اس شہر دل آرا کے لئے
کوئی امید
کوئی حرف
دعا لے جانا
بے یقیں دل کو
ذرا چین سا آ جائے گا
چند لمحوں کو مرا شہر بہل جائے گا

روشہ مزوری

عبدالعزیز بگٹی

باجو، گیست و پنچ سال ئے ورنائے اث۔ اِشیا ٹھیکیدار حاجی محمد علی آ دَگانی پکّو کنغ آ ٹھیکہ یا روشا مزوری کھذ۔

اِشی ئے سئے گوہارا ثنت۔ یکّے سِیر بیثو شُذغ اَث و دو ِکسن سَن اَثنت۔ دو ِکسا ئیں براث اثنتی۔ ہماں سرکاری سکولا وانغئے ثنت۔ اِشی ماث وپِھذ پیرا ثنت۔ کارو کُوڑی آں شہ رَہثغ اثنت۔

ٹھیکیدار حاجی محمد علی آ پھجی آ اِشیا را سئے سال بیثغہ کہ ٹھیکہ آ کارا کھنغئے۔ کار بیثیں تہ اِشیا روشہ کمائی مان کھاتک، ناہیں دَری اِنگو آنگو پوریہات کُھذانتی۔

حاجی محمد علی مزائیں ٹھیکیدارے اَث۔ علاقہ ایم پی اے آ گوں حاجی صاحب ئے داث و ِگپت و بَند و نیاذ اَث۔ دفترانی صاحواں دے رَو آتکین اَتی۔ پہ ہمانکہ ہرحکومت ئے مان آتکیں، حاجی صاحبا راٹھیکہ گیشتر ا یدر مِل اِثنت۔ باجو آ دے کار کُھث۔

حاجی صاحب مزوراں گوں آنگہ تہ جوانی پیش کھاتک پر کسّے آ کہ کارا دیر کُھذیں یا غلطی ئے کُھذینی تہ ہما نہی آ را پِٹ ولعنت، زاوگند گوار ینتی و ہماں روشہ مزوری ئے نیم کاٹ اِث گرڑ دینتی۔ کارہ لافا کہ کسّے دستا شئے زیان بیثیں تہ ہمانہیا شہ ہماں شئے اے دو قیمت وصل کُھذی۔ اگر کسے آ اے مڑدہ اصول مہ مَن اِثیں تہ ہماں کارا شہ فارغ کُھذی۔

مرشی کارا سرا باجو آ را سر بیغا دیر بیثغ اَث۔ وقتاَ گوں نہ پُجغہ سوبّا ٹھیکیدارئے جھیڑغہ تُرس ئے خیالاں اِشی دِلاَ را رَو آتکیں بستہ۔ پیشا دو دھکا دیر بیغہ سَوّبا ٹھیکیدارا، مزورانی نیاما جھیڑِث اَث و بے عزت کھذغ اث۔ اے کہ آتکہ تہ اِشتافی کارہ چکّا شُذا۔ چمے آ دیشہ یکّے نہ دیشہ اے کارا شروع بیثہ۔ رَحمو آ پھول کُھذا ''باجو حیر تہ استیں، مرشی دیرا آتکغ ایث؟

''یار زی کار مشکل اَث، مانیتئی۔ ڈُراہیں روش گرمہ آسیں لُک لافا ڈامبر گل را آس دیغ و دَگا را رِتکغ اَنت۔ ہمے وجہہ آمناں گرما جھذا۔ دوشی ڈُراہیں شف تَفا ِگپتہ، و وھاو نیا تکہ۔ پہ ہمانکہ بانگھئی دیر پاغہہ بیثغاں۔''

''جوانیں کہ حاجی موگھا آ (ٹھیکیدارا حاجی محمد علی آ را مزوراں زَہرا گوں حاجی موگھا نام بَستغ اَث) نہ دیثغئے ناہیں مزوری نیم شُذغ اث۔'' رَحمو آ گوشتہ۔'' نہ دیثغاں تہ موگھا نہ دیثغاں، ہماِ چوٹ پھاذیں بوذو آ تہ دیثغاں۔ ہماں تہ رُمبی حالا پچیّنیثی۔'' باجو آ زہراَ گوں ولدی داثہ۔

بوذو، مزورے اَث پر ٹھیکیدارہ چاپلوسی و جاسوسی کُھذ حاجی آ را مزورانی ہَرٹھوئے کہ حال پچینیتی۔ ہمے جاسوسی و مزوردژمنی سوّباَ مزوراں نفرتا گوں را ''چوٹو'' کُھذ۔

اے مڑد ہمے مجالسہ لافے ثنت کہ بوذو آ تکہ۔ باجو آ دیرواری چاریثہ، تہ گوئشتئی ''چپاکن چوٹو پجثہ''۔

''باجو مرشی دیر کھذ ئے''۔ بوذو آ تنز نمونہ پھول کھذا۔

''ہا یار بوذو، دوشی تفا ِگپتغ آں بیمارا ثاں پہ ہمانکہ کھمرڑ و دیر بیثہ۔ شوا دے کار بنگیژ کھذا، من دے پچیّثغ اَنت۔''

تھہ بیمار شئے تہ تھراڈ اغدارا رَوغی اَث۔''

اِنّا یار تھرا سائیں مہنگائی سببا گزارانہ بی اغیں۔ یکّے تہ اول مزوری کمّیں دوہمی چھٹی آ کھناں تہ چکانی گزارانہ بی''

''شوا سنگت کارا دیر کھائے۔ حاجی شوئے تنخواہ کاٹی گُڈ شوا پِٹڑا کھنے کہ مئے تنخواہ نا حقاَ کاٹ اثئی۔'' بوذو آ زہرا گوں باجو آ ولدی داثہ و رائی بیثہ۔ باجوء □ دے بوذو پلوا واجھائنتہ و زہرا گوں تُرُنڈانا گوئشتی، ''گرڑدِنا گھرڑا نا روغیں، نی رَوث ڈاھہ پچینی۔''

''اِشی را ڈاہ بَری آ گوں پچھے مِلغیں۔'' رحمو آ پھول کھذا

''ریخ مِلغاینتی۔ بس ہزارے دو مزوری آ شہ پُشتہ دیغینی۔ پہ ہمانکہ ڈاہ بَری کھنت۔'' باجو آ ولدی داثہ۔

ڈُراہیں روش کار کُھذیش۔ ریخ، گوسکڑی وڈامبر دَگاّ را رِتکئیش۔ روش گرم اَث۔ پیشینا رَندا باجو آ را آسیں تفا ِگپتہ۔ سنگتاں گوئشتہ ''تھہ دروکہ ساہی آ کن۔ یک سنگتے آ آف اِشی سرا را رِتکغ اَنت کہ تف کم بی۔ دیغر آرندا چُھٹی بیثہ۔ باجو گوں آسیں تف و ِسستغیں ساہے آلوغا آتکہ۔

گڈی بانگھنا ماثا کارانہ اِشتہ۔ ھَندا تفہ درمان واڑتغ اَنتی۔ ماسی شاری آ گرمہ جھاڑ جھذا۔ گوئشتی مزائیں گرمے آ جھذا۔ سئے کنڑو بگّی ایں وسّل جھاڑ یثو داثئی'' سئے روشا تک جھاڑا دے جنائیں۔

پھذ یرا روشہ در کفغا شہ پیشا و بیگھِنا مغربا رَندا مَشقانی ساڑتیں آفاں را وَسّلا بُرّ مان کن۔ ہماں آفاں گوں جانا شوذ۔ امیدیں تف گرڑ دی نے ایث۔''

سئے روشا رَندا اے مڑد کارا شُذا۔ پر تفا جانہ سیخ گشتغ اث۔ مہینہ پیلوّ بیثہ۔ بیگھِنا حاجی آ مزورلوٹھائیثغ اَنت کہ مزوری آں دیاں۔

باجو با رَوّ آتکہ۔''ایذا ڈیبی آ جَن۔''

اِشی ڈیبی جھذا۔''ہاں ِگرزرّاں لیک سئی۔'' حاجی آ زرّ باجو آ را داثغاں۔ باجو آ لیکیثغ اَنت،'' حاجی صاحب اے دھکی تہ باز کاٹیثئے۔''

''ابّا دو سئے روشا دیرا آتکغئے۔ سئے چیار روشا اَصُل آتکغئے چی نا۔ باقی تھئی مزوری ہمِش اَنت۔''

اِشی دلا را زہرئے، تنگی و بے وسی ئے احساسے پیدا بیثہ۔''نی ڈُراہیں مہینہ آمن داہ ہزار کلدارا گوں تھاں رنگا گوازیناں۔''

مہمان

مہتاب جکھرانی

آنہی زندئے کلیں خوشی آنہی مرگانی لافا مان اث۔ دو ماہ پیشا مرگانی نادراہی یے آ آنہی مزائیں مرگے کُشتغ اث۔ عالما آنہی سراتو کانی کنغ شروع کثہ کہ آں کنجوسے کہ حذائی نامادِہ یہ مرگے حیریات نہ کنت، ہذیں نی آنہی کوکاہڑا را نادراہی یے کپتہ۔

آنہی باروا مشہوراث کہ دنیائے کلاں شہ مزائیں کنجوس ہمیش ایں۔ کسارا گیر نہ ایں کہ کذی آنہی مہمانے آختہ یا دِیرا آختغیں سیادے آرا دعوتے کثو آنہی نغنے کث ئی۔ ہروختا کوکاہڑے واڑے ٹاؤ چودھارا پھرغ ایں۔

نیٹ دوا درمان کنانا ایشی ئے چی یے مرگ دراہ بثغ انت، ایشیا نشتو حذائی دربارا دعالوٹثہ " یا حذا تہ مئیں مرگاں راناداراہی، بلاو ستراں ژہ رکث۔۔۔! مئیں حلک ئے منحوساں ژہِ دہ مئیں مرگانی خیالا کن کہ اے بے مرادانی دعایاں ژہ مئیں مُرگ چی یے مڑتہ او چی یے مرکی بیثہ۔ یا حذا ہر کذیں نی مئیں مہمانے آختہ یا دراشہ سیادے آختہ من مرگے آ را دست چھریناں تئی راہا حیریات کناں۔۔۔! وختے مرگانی آنو یے دِہ دست چھریناں وراں۔۔۔! آمین۔ثم آمین"

نی ایشی مرگ دراہ بثغ اشت۔ صحو و بیگہاں بانگو آنی بانگ چیڑاٹ اث۔ اے نی خوش اث۔ ایشی دلا جوانی آ گیراث کہ اے کل حذائے مہربانی انت، ہذیں نی حذا مہمانے بیاری تہ من یہ مرگے دست چھریناں حیریات کناں تاکہ حذائی برکت گوارانت او مالا ابرکت بیث۔

رمضان ماہ گُستہ، ائیدئے سئیمی روشا ایشی ئے کہنیں سنگتے آ فون کثہ کہ آں مرشی آنہی ائید موارکی آ پیذاغ ایں۔ اے اشکنغا پذ آنہی دل ساڑت بیثہ کہ شکریں مرشی حذا مہمانے آرغیں، تاکہ اے حذائی راہا حیریات تے کنت۔

مہمان آختغ انت۔ مہماناں را شربت ورائنغا پذ گُشت ئی "اداشوا نندیت، من رواں شوے واسطہ کُکڑے کناں، قسمتا آختغ ایت، نغن شوارا مناں گُروغی ایں۔" مہماناں دیثہ کہ اے مڑ آف صلاح دِہ نہ جنت مرشی کُکڑ صلاحا جنغیں تہ ایشی نغن ورغی بیثہ۔

اے کُکڑانی واڑ و ٹاؤ آ شثو مزائیں چلھایے پولغا شروع بیثہ کہ حذائی راہا جوائیں چی یے حیریات کنغی ایں۔ یہ چلھایے گپت ئی، کمیں دیر شثہ تہ ایشیا آنہیا شہ کمیں مزائیں چلھایے دیثہ۔ اے اِشتو آنہی میڑینغا شروع بیثہ۔ مرگانی کڑوست کڑاست اشکثو مخلوق ایشی پلوا چاری بیثہ کہ ایشیا را مرشی چے بیثہ؟ کارچ نزیخا ایری آ دیثو نکّو یے آ گُشتہ " مناں باور نیائغیں کہ اے مڑ حیریات تے کنت یا کسے آرا او را ائینیث۔۔!"

نیٹ آنہیا ہماں چلھا گپتہ۔ اے مڑدا چلھا کارچ شیرا آرتغ اث کہ ایشی دیما شہ یہ پھروئیں چلھایے گُستہ کہ ایشیا شہ کمیں مستراث۔ ایشیا ہڑدوئینانی پلوا گندانا ہے فیصلہ کثہ کہ ہڑ و مہمان من دِہ داشت نکناں ہذیں مرشی بایدیں جوائیں کُکڑے کناں، حذا دِہ راضی بیث او سنگت دِہ خوش بنت۔ نکّو دفاچُثو وثی لوغا ژہ گندغ ایں۔ ایشیا کارچ ایرکثو کُکڑ اِشتہ تہ نکّو آ کندغ ٹہکایے جثہ۔ نکّو کندغا شہ پذا دوہمی مڑ دمانی کندغ توار دِہ آختہ۔ نی مخلوق ہے رنگا سئیلائے کنگیں گُش ئِے کرکٹ ئے میچے جزغیں۔

" دیث ئے۔۔۔ دیث ئِے۔۔۔۔ !

اے کنجوسا کُکڑ یلو کثہ۔" یہ ورنا یے آ کندانا دوہمی آ گُشتہ۔ نی اغدہ ہماں چلھا میڑینغا شروع بیثہ۔ آنہی رُگرغا گُراث کہ ایشیا را خیال آختہ کہ چے آ پہ نواں من کسائیں بانگہ آ گراں۔ آنہی رند اِشت ئی تہ مخلوقا کندغ ٹہکایے جثہ۔ نکّو کندانا کندانا ڈغارا نشتہ،" بدبخت تئہ مارا کندینغا پاے کارا کنغ ئِے چے؟ مئے تہ لافا دڑد کپتہ "اے کسے پلوا دھیانا دیئغا نہ اث۔ نی میڑینانا بانگو گپت ئی۔ "اڑڑ ہیے! ایشیا مرشی مزائیں دلے کثہ، دراہیں بانگو یے حلال کنغیں، ما تہ زیندغی آ ایشی اے را نادراہیں چُوری یے حلال کنغا دِہ نیثہ۔" یہ سویث ریشیں مڑدے آ حیران بیّانا گُشتہ۔

ایشیا حلال کنغا پہ بانگو لیٹینغ اث کہ اسکوٹرے ئے توار آختہ، کارچ بانگو گڑدنا گُر بڑتی، آں پلوا دیث ئی مہمان روغ اشت۔ جلدی کارچ بانگو گڑدنا شہ دراکثو گُشتی "حیریں دوہمی چکرا کہ مہمان آختغ انت گڈ اے بانگو دِہ مزن بیث، گوژد باز داث۔"

دوہمی پلوا مخلوق ہیل اث کہ نواں دوہمی مرگے گیڑت ائیدا کنت مگرا اے مرگانی لیکھغا شروع بیثہ۔

تعلق

حنا خراسانی رضوی

فیکٹری کا چکر لگا کر میں جونہی اپنے آفس کے شاندار کمرے میں آیا تو میری نظر سیدھی میز پر رکھے کلینڈر پر پڑی جس میں جون کی چھ تاریخ نمایاں تھی۔ تاریخ پر نظر ڈالتے ہی چارلس نورمن کی صورت میری آنکھوں کے سامنے آ گئی جس کی بدولت یہ دن میرے لیے یادگار بن گیا ہے۔ چارلس نورمن کون تھا اور میری زندگی میں اس کی اور اس دن کی اہمیت کیوں ہے؟ یہ جاننے کے لیے آپ کو میری کہانی سننی پڑے گی۔

یہ آج سے سولہ سال پہلے کی بات ہے، میں، عامر قریشی پاکستان کے ایک پسماندہ علاقے سانگھڑ سے اس ترقی یافتہ مغربی یورپ کے ملک سویڈن کے شہر اپسالا میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ میرے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے والدین نے اپنی ساری جمع پونجی اس امید پر میرے اوپر صرف کر دی تھی کہ میں باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جب کسی اچھی جگہ افسر لگ جاؤں گا تو پورے کنبے کے دلدّر دور ہو جائیں گے۔

جنوری سنہ دو ہزار آٹھ میں، میں یہاں آیا تھا۔ میرا روز کا معمول کچھ یوں تھا کہ صبح یونیورسٹی جانا، سہ پہر تک واپس آ کر کمرے کی صفائی ستھرائی کرنا اور کھانے وغیرہ کی تیاری کرنا، کھانے کے بعد کچھ دیر پڑھائی کرنا اور پھر سویرے سو جانا تا کہ آدھی رات کو اٹھ سکوں۔ دراصل اپنے ذاتی اخراجات پورے کرنے کے لئے میں اخبار ڈالنے کا کام کرتا تھا جس کے لئے مجھے آدھی رات کو اٹھ کر جانا پڑتا تھا۔ گو کہ یہ ایک سخت نوکری تھی خاص کر سردیوں کے زمانے میں کہ جب درجہ حرارت منفی میں ہوتا ایسے میں گرم رضائی سے نکلنا ہی کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا چہ جائیکہ گھر سے باہر جانا لیکن میرے لئے یہ نوکری یہاں میری بقاء کا باعث تھی۔

زندگی کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے کہ میری زندگی میں وہ دن آ گیا کہ جس دن میری چارلس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ جون کی چھ تاریخ تھی۔ مجھے یہاں آئے ایک سال سے کچھ اوپر ہی ہو چلا تھا لیکن ابھی تک میرا دل یہاں پوری طرح نہیں لگ پایا تھا حالانکہ اس شہر کی خوبصورتی ہر موسم میں اپنی مثال آپ ہی دکھتی تھی مگر موسم بہار میں تو ہر سو پھیلے سبزے اور رنگ برنگے پھولوں کے باعث منظر ہی کچھ اور ہوتا۔ بہار کی آمد کے ساتھ ہی یہاں نہ صرف زمین اپنا چولا بدل لیتی بلکہ یہاں کے باسیوں کے چہروں پر بھی موسمِ بہار کا بھرپور عکس دکھائی دینے لگتا ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ میری آنکھوں میں تو میرے اپنے گھر کا کچا آنگن بسا ہوا تھا۔ جہاں سہ پہر ہوتے ہی میری اماں پانی کا چھڑکاؤ کر دیتی تھیں جس سے مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ صحن میں بابا کے ہاتھوں کے لگے بیلے، موتیا اور ہارسنگھار کے پھولوں کی خوشبو میرے وجود میں بسی ہوئی تھی۔ میں ان پھولوں کو چن کر مٹھی میں بھر کر گھنٹوں سونگھتا رہتا تھا اور میری چھوٹی بہن، نرجس ان کے ہار بنا کر گھڑے اور صراحی پر ڈال دیتی تھی۔ صحن کے کونے میں کھڑا وہ سالوں پرانا بوڑھا برگد بھی پردیس میں ہر دم میرے ساتھ رہتا تھا۔ گرمیوں کی حبس زدہ شاموں میں جس کی چھاؤں میں پڑی چارپائی پر لیٹنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

اپسالا میں، میں ہوسٹل کے جس کمرے میں رہتا تھا اس میں ایک بالکونی بھی میسر نہیں تھی البتہ مسہری کے داہنے طرف دیوار میں ایک دو پٹ کی کھڑکی تھی جو لبِ سڑک کھلتی تھی۔ سڑک کے اس پار ایک خاصہ بڑا عوامی پارک تھا جس میں گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی علاقہ مکین اور ہوسٹل میں رہنے والے طلباء و طالبات روز بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔

یہ چھ جون سنہ دو ہزار نو کی بات ہے۔ ان دنوں یونیورسٹی میں امتحانات سے فراغت کے بعد تعطیلات چل رہی تھیں۔ میرے دوست اور کئی ہم جماعت چھٹیاں منانے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے مگر میں پیسے کما کر گھر بھیجنے کی خاطر وہیں رکا ہوا تھا۔ اس دن میں تنہائی سے اکتا کر کھڑکی میں کھڑا تھا کہ میری نظر پارک میں آتے جاتے لوگوں پر پڑی اور اسی دم میں نے بھی پارک کی کھلی فضا میں جا کر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے تھرموس میں چائے ڈالی اور رضا علی عابدی صاحب کی ''شیر دریا'' لیکر پارک میں چلا آیا۔ پارک میں بچے، بوڑھے اور جوان سب ہی موجود تھے اور خوب گہما گہمی کا سا سماں تھا۔ میں لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کسی پرسکون گوشے کی تلاش میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ پارک کے دوسرے سرے پر ذرا نشیب میں ایک بنچ پر مجھے ایک بوڑھا شخص اکیلے بیٹھا دکھائی دیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سوائے اس ایک بنچ کے کوئی بنچ ایسی نہیں تھی کہ جس میں کوئی اکیلے بیٹھا ہوا ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ کر وہاں پہنچا اور مسکرا کر اس بوڑھے شخص کو دیکھتے ہوئے ''ہیلو'' کہہ کر ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی آس پاس موجود کئی لوگوں نے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھا گویا میں نے کوئی معیوب کام کر دیا ہو۔ میرے برابر میں بیٹھے بوڑھے شخص نے بھی اچٹتی ہوئی سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر رخ موڑ کے انہماک سے سامنے بنے ہوئے تالاب میں بطخوں کو تیرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں نے تھرموس سے اپنے لئے چائے نکالی اور اخلاقی مظاہرے کے طور پر اس سے

پوچھا کہ کیا وہ چائے پینا پسند کرے گا؟ اس نے میری پیشکش سنی ان سنی کر دی۔ میں بھی سر جھٹک کر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ برابر میں بیٹھا بوڑھا شخص مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے کتاب بند کی اور مسکرا کر اس کی سمت دیکھا تو نظریں ملنے پر وہ ایک دم گھبرا گیا اور تیزی سے اٹھ کر ایک جانب چل دیا۔

اس دن کے بعد سے میں روز ہی پارک میں جانے لگا اور پتہ نہیں کیوں مجھے نشیب میں بنی اس بنچ پر بیٹھنا بھی اچھا لگنے لگا تھا جس پر کبھی بھی اس بوڑھے شخص کے علاوہ کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا تھا مگر مجھ سے کبھی بات نہیں کرتا تھا البتہ کن اکھیوں سے میری جانب دیکھتا رہتا تھا۔ اسی معمول میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا۔ ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ میں حسبِ معمول بنچ پر بیٹھ کر اپنی کتاب کھول ہی رہا تھا کہ بوڑھے شخص نے میری طرف دیکھا اور شستہ انگریزی میں کہنے لگا۔ ''میں چارلس نورمن ہوں۔''

میں مسکرایا اور جلدی سے بولا۔ ''میرا نام عامر قریشی ہے اور میں پاکستان سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔''

''اچھا'' کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا اور نظریں سامنے تالاب پر جما دیں۔ میں دوبارہ اپنی کتاب کھولنے ہی لگا تھا کہ وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم پاکستان سے آئے ہو مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم کہاں سے ہو۔ اہم بات تو یہ ہے کہ تم ابھی یہاں ہو۔''

میں نے بلا سوچے سمجھے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور بات بڑھانے کی خاطر بولا ''تمہارا شہر بہت خوبصورت ہے۔ یہ پارک بھی بہت اچھا اور خوبصورت ہے۔ یہاں بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ تم بھی شاید اسی لئے روز یہاں آتے ہو؟''

اس نے ''ہوں'' کہہ کر سر ہلایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''تمہارے نزدیک خوبصورتی کیا ہے؟

میں نے کہا ''ہر وہ چیز جو آنکھوں کو بھلی لگے۔''

میرے جواب پر وہ کہنے لگا'' کیا خوبصورتی یہ نہیں کہ جو چیز جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اس پر پوری اترے؟''

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری جانب دیکھے بغیر بولا۔ ''کل ملیں گے'' اور پھر ایک طرف چل دیا۔

اگلے دن جب میں پارک میں پہنچا تو وہ بنچ پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ سورج کی چمکیلی کرنیں اس کے چہرے پر براہ راست پڑ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ مراقبے کی حالت میں ہے۔ میں آہستہ سے بنچ پر بیٹھا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب کھول ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔ ''آج تم اپنا چائے کا تھرموس نہیں لائے؟''

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔'' نہیں! دراصل چائے کی پتی ختم ہو گئی تھی اور میں بازار نہیں جا سکا لیکن۔۔۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم مجھ سے اتنے بھی انجان نہیں ہو جتنا میں سمجھ رہا تھا۔''

اس نے اپنے پیروں کے پاس پڑے ایک کپڑے کے تھیلے میں سے ایک تھرموس اور دو پلاسٹک کے کپ نکالے اور تھرموس سے سیاہ کافی انڈیل کر ایک کپ میری جانب بڑھا دیا۔ گو کہ مجھے سیاہ کافی پسند نہیں تھی مگر اس کا دل رکھنے کی خاطر میں نے شکریہ کہہ کر کپ تھام لیا۔ کافی پینے کے دوران میں کئی بار اس امید پر اس کی جانب دیکھتا رہا کہ شاید وہ کوئی اور بات کرے لیکن وہ پورے انہماک سے کافی پینے اور تالاب میں کھیلتی بطخوں کو دیکھنے میں مصروف رہا۔ اُس کے اس طرح سے نظر انداز کر دیئے جانے پر میں بھی رخ موڑ کر ارد گرد لگے رنگ برنگے پھولوں اور اونچے اونچے درختوں پر شور مچاتی چڑیوں کو دیکھنے میں لگ گیا۔ میں اس خوبصورت منظر میں مگن تھا کہ اچانک چارلس نورمن نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔ ''کسی

بھی چیز کی خوبصورتی یہ ہے کہ جو چیز جس مقصد کے لئے بنی ہو وہ اس پر پوری اترے۔۔۔ اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔'' کیا تم سقراط کو جانتے ہو؟''

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتا وہ کہنے لگا۔'' سقراط کو بہت کم لوگ جانتے ہیں ہاں البتہ واقف شاید بہت سے ہوں۔''

میں جلدی سے بولا۔'' میں جانتا ہوں۔ سقراط ایک یونانی فلسفی تھا جو ۴۷۰ قبل مسیح میں ایتھنز میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام سوفرونسکس اور ماں کا نام فینتے ریتی تھا۔ اس کا باپ مجسمہ ساز اور ماں دایہ تھی اور ہاں یہ کہ اس کی موت زہر کا پیالہ پینے سے ہوئی تھی جو ۔۔۔''

''اچھا! تو تم بھی سقراط سے واقف ہو۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے ٹوکا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔'' سقراط کی نظر میں ہر چیز میں خوبصورتی ہے بس ہمیں اس ماخذ کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہے جو خوبصورتی کو آشکار کرتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کمہار کو چاک پر برتن بناتے دیکھا ہے کہ وہ کس طرح وہ چاک کو گھما گھما کر مٹی کے لوندے میں چھپا خوبصورت برتن نکال لیتا ہے۔ جانتے ہو! سقراط کو ایتھنز کا بدصورت ترین شخص کہا جاتا تھا اور وہ ہمیشہ اپنے لئے یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ خدا میرے باطن کو خوبصورت بنا دے۔''

اس دن میں نے چارلس سے سقراط کے بارے میں بہت کچھ جانا۔ پھر تو یہ ہمارا معمول ہی بن گیا۔ ہم ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے۔ فلسفہ، تاریخ، معیشت، سیاست، جغرافیہ، سائنس اور ادب، کون سا ایسا موضوع تھا جس پر وہ دسترس نہیں رکھتا تھا۔ اس کی صحبت مجھے بہت مزہ دیتی تھی حالانکہ ہماری عمروں میں کافی فرق تھا۔ میری اس بات پر ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔'' عمروں کا فرق کچھ نہیں ہوتا عقلوں کا فرق خلا پیدا کر دیتا ہے۔''

مجھے بس اس کی ایک بات پریشان کیے رہتی تھی

اور وہ یہ کہ وہ دنیا جہاں کی بات کرتا تھا مگر کبھی بھی اپنے متعلق کوئی بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کبھی میرے بارے میں کچھ جاننے کا متمنی ہوتا تھا۔ اس کا یہ انداز بھی عجیب تھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے اچانک جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا اور پھر یہ کہہ کر چل دیتا ''کل ملیں گے۔''

ہماری ملاقات کا یہ سلسلہ ڈیڑھ ماہ تک یونہی چلتا رہا۔ اس دوران میں نے اسے کھانے کی دعوت بھی دی مگر اس نے معذرت کر لی اور کبھی یوں بھی ہوا کہ میں نے چاہا کہ اس کے ساتھ اس کے گھر تک چلوں مگر اس نے خاصی رکھائی سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ کبھی اس نے میری پیش کی ہوئی چائے بھی نہیں پی جبکہ میں کئی بار اس کی لائی ہوئی سیاہ کافی سے مستفید ہوتا رہا تھا۔

یہ جولائی کے آخری دنوں کی بات تھی کہ میں ایک روز حسبِ معمول پارک میں پہنچا تو وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اتنے عرصے میں آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے موجود نہیں تھا۔ میں دیر تک وہاں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور پھر مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔

اگلے دن میں وقتِ مقررہ سے پہلے ہی پارک میں پہنچ گیا مگر وہ اس دن بھی نہیں آیا۔ تیسرے دن بھی وہ جب نہیں آیا تو میں نے پارک میں اردگرد بیٹھے لوگوں سے اس کی بابت دریافت کیا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں البتہ برگتا نامی ایک ادھیڑ عمر کی عورت جو اپنے کتے کے ساتھ پارک میں آتی تھی، کہنے لگی۔ ''چارلس ایک تنہائی پسند انسان ہے۔ وہ اُدھر پارک کے پیچھے والی عمارت میں پہلی منزل پر رہتا ہے اور کئی سالوں سے میرا پڑوسی ہے لیکن وہ کسی سے بھی ملنا جلنا پسند نہیں کرتا ہے، خاص طور پر وہ تم ایشیائی لوگوں سے تو بالکل بھی میل جول پسند نہیں کرتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ وہ کیسے یہاں تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا رہا ہے۔ اس سے پہلے اس نے ایسا کبھی نہیں کیا شاید تم میں کوئی خاص بات ہے۔''

میں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ تم اس کی کئی سالوں سے پڑوسی ہونے کے باوجود شاید اس سے صرف واقف ہی ہو اس کے بارے میں جانتی نہیں ہو۔''

اگلے دن میں تازہ پھولوں کا گلدستہ لیکر اس عمارت کی طرف چل پڑا جہاں برگتا کے مطابق چارلس کی رہائش تھی۔ داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے مکینوں کے ناموں کی تختی پر اس کا نام تلاش کیا اور اس کے ساتھ لگی گھنٹی بجادی۔ چند لمحے گزرنے کے بعد اسپیکر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی ''دروازے پر کون ہے؟'' میں نے اسپیکر کے قریب جا کر اپنا تعارف کرایا اور چارلس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ دوسری جانب کچھ دیر خاموشی طاری رہی اور پھر وہی آواز سنائی دی۔ ''میں معذرت چاہتی ہوں کہ محترم چارلس اس وقت آپ سے ملاقات کے خواہاں نہیں ہیں۔'' اور اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔

یہ الفاظ سن کر مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ کیا واقعی اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے مراسم بہت پرانے نہیں ہیں مگر ہم بہت دنوں سے اچھے دوستوں کی مانند تو ہیں۔ کیا برگتا صحیح کہہ رہی تھی کہ چارلس لوگوں سے اور خاص طور پر ایشیائی لوگوں سے میل جول پسند نہیں کرتا ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں خاصہ دلبرداشتہ ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ ہوسٹل پہنچنے پر نیچے لاؤنج میں مجھے ہوسٹل کی منتظمِ اعلیٰ مسز ہیلین مل گئیں۔ وہ ایک برطانوی خاتون تھیں اور یہاں بیس سال پہلے شادی کر کے اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں۔ ہیلین ایک خوش مزاج خاتون تھیں۔ ویسے تو وہ سب کے ساتھ اچھے سے پیش آتی تھیں مگر میرے ساتھ خاصی شفقت دکھاتی تھیں۔ میرا حال احوال پوچھتی رہتی تھیں اور اکثر مجھے انگلش چائے کے لئے مدعو کرتی رہتی تھیں۔ میں نے مسز ہیلین کو ہیلو کہا اور ان کی خیریت دریافت کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا میں ان سے کچھ دیر بات کر سکتا ہوں۔ وہ شفقت سے مسکرا کر بولیں'' کیوں نہیں! مجھے تمہارے ساتھ بات کر کے ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ آؤ وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' انہوں نے سامنے رکھے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چند رسمی گفتگو کے بعد میں نے ان سے پوچھا ''ہیلین آپ تو یہاں بہت عرصے سے ہیں کیا یہ بات سچ ہے کہ یہاں کے لوگ ہم باہر والوں کو پسند نہیں کرتے ، خاص طور پر ہم ایشیائی لوگوں کو؟''

میری بات سن کر وہ مسکرائیں اور بولیں'' ایسا کیوں کہا تم نے؟''

میں نے چارلس کی بابت ان کو بتایا تو وہ کہنے لگیں۔'' میں کسی انفرادی شخص کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتی لیکن اپنے پیشے کے لحاظ سے میرا مختلف لوگوں سے ہمیشہ ملنا جلنا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کے لوگ منافقت نہیں کرتے اگر چارلس تم کو ناپسند کرتا تو کبھی تم سے مراسم پیدا نہ کرتا۔ ضرور کوئی اور بات ہے۔ تم بدگمان نہ ہو اور دوبارہ جا کر معلوم کرو۔''

میں ان کا شکریہ ادا کر کے کمرے میں آ گیا۔ نامعلوم کیوں مگر رات بھر مجھے چارلس کا ہی خیال ستاتا رہا۔ اگلے دن ناشتے کے بعد میں دوبارہ تازہ پھولوں کا گلدستہ لیکر چارلس کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک ایمبولینس اُسی وقت وہاں سے روانہ ہوئی۔ میں ابھی ایمبولینس کو جاتے دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں عمارت کا داخلی دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر آئی اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی'' کیا آپ کا نام عامر قریشی ہے؟''

''جی ہاں! مگر آپ مجھے کیسے جانتی ہیں۔'' میں نے سر ہلا کر حیرت سے کہا۔

وہ کہنے لگی۔'' میں محترم چارلس نورمن کی نرس ہوں اور ان کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔ وہ اسی ایمبولینس میں تھے جو ابھی آپ نے جاتے ہوئے دیکھی ہے۔۔۔ آپ کے لیے انہوں نے ایک پیغام دیا ہے۔''

''میرے لئے؟ وہ کیا؟'' میں نے بے صبری سے کہا۔

اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا اور اداسی سے مسکرا کر بولی۔'' انہیں یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔''

میں نے شکریہ کہہ کر لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بیقراری سے کھولا تو اندر ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا۔'' اب ہم نہیں ملیں گے۔''

میں نے کاغذ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے درمیان یہ کیسا تعلق تھا؟ میں اس کے لئے کیوں اتنا پریشان ہو رہا ہوں؟ اس کے لئے جس نے کبھی مجھے اپنے گھر بھی نہیں بلایا اور جب میں خود آیا تو ملنے سے ہی انکار کر کے مجھے دروازے سے ہی لوٹا دیا۔ اور پھر اسے آج میرے آنے کا یقین بھی تھا؟ مگر کیوں؟''

میں بوجھل دل کے ساتھ یہ سب سوچتا ہوا ہوسٹل واپس آ گیا۔ کوشش کے باوجود میں چارلس کو کسی صورت بھلا نہیں پا رہا تھا۔ کئی مرتبہ پارک میں اس امید کے ساتھ گیا کہ شاید وہ وہاں بیٹھا ہو مگر ہر بار مایوسی ہوئی۔

گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں اور سردیوں کی چاپ سنائی دینے لگی تھی۔ تعلیمی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ امتحانات میں دو ماہ سے بھی کم وقت رہ گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے پاکستان چلے جانا تھا لہٰذا میں نے اپنا سارا دھیان پڑھائی کی جانب موڑ لیا۔ ایک دن میں یونیورسٹی سے آ کر کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میرے ہیلو کہنے پر دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز آئی کہ وہ برٹل سیوِن سون بول رہا ہے اور پھر اس نے پوچھا۔'' کیا آپ عامر قریشی بات کر رہے ہیں؟''

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔'' جی! میں عامر قریشی بات کر رہا ہوں۔''

وہ کہنے لگا۔'' ہمارے موکل محترم چارلس نورمن نے آپ کے نام ایک وصیت چھوڑی ہے۔''

''میرے نام وصیت۔'' میں نے حیرانگی سے کہا۔

''جی ہاں! آپ کے نام۔ کیا آپ کل دس بجے ہمارے دفتر تشریف لا سکتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ مجھے پتہ بھیج دیجئے۔'' میں نے کہا۔

اگلے دن جب میں وکیل کے دفتر پہنچا تو اسے اپنا منتظر پایا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بیٹھنے کو کرسی پیش کی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے چارلس کی وصیت کے بارے میں کچھ پوچھتا، اس نے میرے سامنے ایک بھورے رنگ کا چھوٹا سا بریف کیس رکھا اور بولا۔'' ہمارے موکل محترم چارلس نورمن صاحب نے آپ کو اس کا وارث قرار دیا ہے۔ کچھ قانونی کاروائی کے بعد یہ سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

ساتھ ہی اس نے ایک بند لفافہ بھی میری جانب بڑھایا کہ چارلس نورمن کی جانب سے اس میں میرے لئے کوئی پیغام ہے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ اس سے لیکر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

ہوسٹل پہنچ کر میں نے بیقراری سے بریف کیس کھولا تو اندر ایک فائل اور دو پرانی تصاویر رکھی تھیں۔ ایک تصویر میں وہ ایک بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے ساتھ درمیان میں کھڑا تھا جس کے نیچے لکھا تھا۔'' والدین'' جبکہ دوسری تصویر میں وہ ایک ایشیائی عورت کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھے کھڑا تھا جس کا آدھا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ تصویر کے پیچھے لکھا تھا'' خوبصورت نسیم کے ساتھ۔''

میں نے بریف کیس میں رکھی فائل کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ چارلس کی طبی نتائج تھے جن کے مطابق وہ ایک ایسی جان لیوا لاعلاج بیماری میں مبتلا تھا جس میں اس کی زندگی کے دن بہت کم رہ گئے تھے۔ میں نے اس کی آخری رپورٹ پر لکھی تاریخ دیکھی تو میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چھ جون سنہ دو ہزار نو۔ اچانک مجھے اس لفافے کا خیال آیا جو چارلس کے وکیل نے مجھے دیا تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے لفافہ نکال کر کھولا تو اس میں ایک اچھی خاصی رقم کا بنک چیک اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ میں نے کاغذ کھولا تو اس میں لکھا تھا'' عامر! ہم اب نہیں ملیں گے مگر ہمارا تعلق کبھی نہیں ٹوٹے گا۔''

انتباہ

عاطف توقیر

ستم نصیبانِ سرزمیں کو پیام پہنچا دیا گیا ہے
نگوں سری کا قیام ہوگا
سبھی نگاہیں جھکی رہیں گی
ہر ایک گردن پہ تیغ ہوگی
ہر ایک شہ رگ پہ ہوں گے ناخن
کہ شہر جب تک نگوں نہ ہوگا
کمان تب تک تنی رہے گی
ہماری اگلی ہدایتوں تک
ہر ایک جنبش تھمی رہے گی

زمین زادے کہ 'انتباہ'
خدا کی مرضی سمجھ چکے ہیں
سو اب زبانوں پہ خامشی ہے
سو اب مقدر میں گالیاں ہیں
چراغ گل ہیں کہ چاروں جانب
اندھیری راتوں کی آندھیاں ہیں
ہمارے حصے میں
اپنے دکھ پر بھی قہقہے ہیں یا تالیاں ہیں

تمہارے نام

نسیم سید

بھور سمے کا
گیان ہے تو
یا۔۔۔۔۔
شام کی گھپ خاموشی کا
بھید بھرا وجدان
انتم سر ہے
سات سروں کا
یا پھر عشق کے
آٹھویں سر کی
تو ساتھی پہچان
کون ہے
کیا ہے
کونسا ہے یہ
میرے بھیتر کا
تجھ سے پیمان؟
صحراؤں سی
خاک اڑاتی تنہائی میں
دھوپ بھری
دکھ کٹھنائی میں
لکھنے، بولنے
سوچنے والی
عورت ہے یہ
اردگرد سرگوشی والی رسوائی میں
ساتھی!
تیری ہمراہی
ہر دکھ کا رکھے مان
تیرے دھیان کے
گھنگھرو باندھیں
رقص کریں
حرف حرف دیوانی
نظمیں
کریں ترا اعلان
یہ دنیا کیا جانے ساتھی
مجھ میں تیری
کونسی مدھرا
کونسا نشہ
دل کاسے کو
کونسا تیرا دان